# اسلامی عقائد و نظریات

تصنیف

حضرت مولانا مفتی
سید مختار الدین شاہ صاحب
دامت برکاتہم العالیہ

خلیفہ مجاز

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ

دار الایمان
DARUL-EEMAAN

# اسلامی عقائد و نظریات

تالیف


حضرت مولانا مفتی

سید مختار الدین شاہ صاحب

دامت برکاتہم العالیہ

خلیفہ مجاز

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ



دار الایمان

DARUL-EEMAAN

# دار الایمان


اسٹاکسٹ:
مولانا سیار الدین حقانی صاحب: 0333-3356034 - 0313-2032828


# اسلامی عقائد و نظریات

تالیف
حضرت مولانا مفتی سید مختار الدین شاہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ


طبع : ستمبر 2020
ایڈیشن: چہارم
ناشر: دار الایمان

DARUL-EEMAAN
www.daruleeman.org


## ملنے کے پتے:


**مرکز**
جامعہ زکریا دار الایمان، کربوغہ شریف ہنگو۔
فون نمبر: 0925692413 / 0335-2223413

**پشاور**
دار الایمان نزد لکی سٹار فلور ملز
بڈھنی روڈ چمکنی پھاٹک پشاور 0300-5954046

**کراچی**
دار الایمان، ایمان منزل، مکان نمبر B-375،
بلاک 10 فیڈرل بی ایریا کراچی
فون نمبر: 0321-3040666

**بنوں**
مکتبہ دار الایمان والتقوی، سورانی، بنوں۔
فون نمبر: 0333-1000425 / 0332-9066545

**قصور**
مولانا سعید صاحب مکتبہ دار الایمان
نزد پرانی چنگی، نظام پورہ روڈ، قصور 0321-6581661

بسم الله الرحمن الرحيم

# فہرست

الحمد للہ الذی اکمل دیننا واتم نعمتہ علینا، والصلاۃ والسلام علی

من ھو عزیز علیہ ما عنتنا

حضرت مفتی صاحب دامت برکاتھم العالیہ فرماتے ہیں:

"عقائد اور ایمانیات دراصل وہ حقیقتیں ہیں جن کو ہم از خود نہیں جان سکتے اور نہ ان کو ہماری ظاہری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں، بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جن کی تعلیم وحی الٰہی قرآن و حدیث کے ذریعے ہمیں حاصل ہوئی ہے اور ان کے متعلق ہم کو یہ حکم ہوا ہے کہ ان حقیقتوں کو مانیں اور ان پر ایمان ویقین رکھیں، دینِ اسلام کا یہ ایمانی واعتقادی حصہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے"

ان حقائق وعقائد کی درستگی جہاں انسان کی ذاتی صلاح و فلاح کے لیے بنیاد ہے وہاں معاشرے کے چین سکون، قوم قبیلوں کے اتحاد و اتفاق اور ملک وملت کے اجتماعی عروج وترقی کی بھی بنیاد ہے۔

لیکن انتہائی افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ تازیانہ زوال کے بعد مسلمانوں نے ایک بڑا نقصان یہ کیا کہ ان کو اپنی کھوئی ہوئی عزت پانے کے لیے اصلاحِ عقائد کی طرف توجہ کی جتنی شدید ضرورت تھی اور جس قدر عقائد کی اہمیت تھی اس قدر انہوں نے مذہب اسلام کے اساس و بنیاد عقائد سے غفلت برتی، یہاں تک کہ آج مسلم معاشرے کی اکثریت جہاں ایک طرف اپنے آپ کو مسلمان کہلانے کے باوجود دین اسلام کے عقائد سے ناواقف ہے وہاں انہوں نے اس ناواقفیت کے باعث بعض غیر قطعی عقائد یا نظریاتی مسائل کو قطعی عقائد کی جگہ دے کر امت مسلمہ میں افتراق و انتشار، اور غیر ضروری لڑائی جھگڑوں کا لامتناہی سلسلہ بھی کھڑا کیا ہے۔

سیدی و سندی مختار الامۃ دامت برکاتہم العالیہ نے حسب عادت زمانہ کے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر معاشرے کے اس بہت بڑے مہلک مرض کی تشخیص اور علاج کا سامان مہیا کرتے ہوئے اس کتاب میں انتہائی آسان و دلنشین انداز میں عقائد کی اہمیت، ان کی اقسام اور ان کی درجات اور حیثیت کی تعین کر کے ان کی ضروری تفصیل کی ہے۔

واضح رہے کہ یہ کتاب جہاں عقائد جیسے اہم موضوع پر مختصر کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت کی ایک اور کتاب کتاب العقائد کی تلخیص بھی ہے، شائقین حضرات عقائد کی مزید تفصیل کے لیے کتاب العقائد کا مطالعہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حضرت کی تمام تحریروں و تقریروں سے وہ سب کچھ عطا فرمائے اور اس پیغام پر ہمارے دل و دماغ کھول کر سمجھنے اور عمل پیرا فرمائیں جو حضرت دینا چاہتے ہیں۔

**نوٹ:** کتاب میں کسی بھی قسم کی غلطی کی نشاندہی کرنے والے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

اخوکم العقیدہ: زین الدین چغرزیؔ

رابطہ نمبر:

0308-5673393

0334-0115949

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد

قرآن وحدیث اور دینِ اسلام واسلامی شریعت کے دو بڑے بڑے اجزاء اور حصے ہیں۔ ایک کا تعلق دل ودماغ سے ہے اور دوسرے کا جذبات وکیفیات سے ہے اور تیسرے کا تعلق انسان کے جسم واعضا کے ظاہری اعمال سے ہے۔ اس تیسرے حصے میں عملی زندگی سے متعلق احکام وہدایات ہیں کہ یہ کام کریں اور یہ نہ کریں۔

دینِ اسلام کے اس پہلے حصے کو ایمانیات، عقائد اور اعتقادات کہا جاتا ہے۔

## ایمانیات اور عقائد کی اہمیت

عقائد اور ایمانیات دراصل وہ حقیقتیں ہیں جن کو ہم از خود نہیں جان سکتے اور نہ ان کو ہماری ظاہری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں، بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جن کی تعلیم وحی الٰہی قرآن و حدیث کے ذریعے ہمیں حاصل ہوئی ہے اور ان کے متعلق ہم کو یہ حکم ہوا ہے کہ ان حقیقتوں کو مانیں اور ان پر ایمان ویقین رکھیں، دینِ اسلام کا یہ ایمانی واعتقادی حصہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ انسان کے تمام افعال اور تمام حرکات وسکنات انسان کے خیالات کے گرد چکر لگاتی ہیں اگر یہ ذہنی اصول (یعنی عقائد) درست اور پختہ ہو جائیں تو ان سے درست نیک خیالات اور جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور یہی عقائد انسان کے خیالات اور جذبات پر حکومت بھی کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ انسان کے تمام اختیاری افعال اور حرکات وسکنات اس کے ارادے کے تابع ہوتے ہیں، ارادہ کو تحریک دینے والے انسان کے خیالات اور جذبات ہوتے ہیں اور انسان کے خیالات وجذبات پر اس کا دل ودماغ حکومت کرتا ہے اور دل ودماغ کی درستگی

عقائد کی درستی، تندرستی اور پختگی سے ہوتی ہے۔

لہٰذا اگر عقائد ہی درست اور صحیح نہیں تو انسان کا دل و دماغ فاسد ہو جاتا ہے، اگر عقائد درست اور صحیح ہیں لیکن راسخ اور پختہ نہیں تو ایسا ناتواں اور کمزور ایمان جذبات اور خیالات کو کنٹرول کرنے سے عاجز ہوتا ہے اور نفس کی ترغیبات اور راہِ حق میں آنے والی آزمائش ان کو راہِ حق سے ہٹا کر ہوائے نفس، نفس پرستی اور دنیا پرستی کی راہ پر ڈال دیتی ہے، لہٰذا انسان کے لیے ازحد ضروری ہے کہ وہ اپنے عقائد کی درستی، تندرستی اور ان کی پختگی میں سخت کوشش کرے۔

## قرآن واحادیث کی رو سے عقائد کی اہمیت

عقائد و ایمانیات کی صحت و تندرستی اور پختگی پر قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور ایمان کا ذکر ہمیشہ عملِ صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور پر کیا گیا ہے اور نیک اعمال کو ضروری اور لازمی قرار دیا گیا ہے اور ایمان وعقیدے کو ہی تمام اسلامی اعمال واخلاق کی اساس اور بنیاد قرار دیا گیا ہے اور اس کے بغیر اچھے اور خیر کے تمام کاموں کو بے بنیاد اور مثل سراب بتایا گیا ہے، اس کے بارے میں قرآن مجید اور احادیثِ رسول ﷺ میں اس قدر آیتیں اور احادیث آئی ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ان آیتوں اور حدیثوں سے ایک مستقل کتاب وجود میں آجائے گی۔ یہاں بطورِ نمونہ قرآن مجید کی دو آیتوں اور صرف ایک حدیث کو پیش کرتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) وَالَّذِينَ كَفَرُوٓا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَآءً ۖ حَتّٰىٓ إِذَا جَآءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا

”جن لوگوں نے انکار کیا ان کے اچھے اعمال ایسے ہیں جیسے چٹیل میدان میں سراب، پیاسا

شخص اس کو پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کچھ نہ پائے۔"
(سورۂ نور:۳۹)

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور دل کی درستی و تندرستی کی اہمیت کو یوں بیان فرمایا ہے:

(۲) یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۞ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۞

"جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد مگر وہ جو اللہ تعالیٰ کے پاس قلب سلیم لے کر حاضر ہو گا (وہی فلاح و نجات پائے گا اور یہی چیز کام آئے گی)۔" (سورۂ شعراء:۸۸-۸۹)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصل قیمت قلبِ سلیم اور تندرست دل کی ہے، تندرست دل سے مراد صحیح اور پاک دل ہے جو شرک، کفر، نفاق، تکبر اور حسد وغیرہ جیسے ناپاک گندے جذبات اور خیالات سے پاک ہو۔

نبی کریم ﷺ نے دل کی تندرستی کی اہمیت کو یوں بیان فرمایا ہے کہ:

اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ
وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَ هِیَ الْقَلْبُ

"خبردار (اس حقیقت کو خوب غور سے سن لو کہ) انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو تو تمام بدن درست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے خبردار (سن لو) وہ (ٹکڑا) دل ہے۔" (بخاری کتاب الایمان)

اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ اگر دل درست اور تندرست ہے، اس کے اندر کفر، شرک، نفاق، تکبر اور حسد وغیرہ جیسے ناپاک اور گندے جذبات اور خیالات نہیں، بلکہ ان کے مقابلے میں اس کے اندر پاک اور صالح جذبات ہیں تو اس سے نکلنے والے اعمال بھی

پاک اور سراسر نفع بخش ہوں گے ورنہ اگر بدن کے اس ٹکڑے کو برے عقائد کفر و شرک، نفاق اور برے اخلاق کے گندے جذبات و خیالات سے بگاڑ دیا گیا تو اس سے نکلنے والے اعمال بھی گندے ناپاک اور صرف نمائشی ہوں گے۔

لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے عقائد وایمان اور اخلاق کو درست کرے اور اپنے آپ کو کفر و شرک، نفاق، تکبر اور حسد وغیرہ جیسی بیماریوں سے پاک کرکے دل کو پوری طرح صحت مند بنائے اور اس کی پوری نگہداشت کرے کہ کہیں بگڑ نہ جائے۔

## عقائد اور ایمان کو درست اور پختہ بنانے کا طریقہ وعلاج

ایمان وعقائد کی اہمیت کے بعد اب عقائد وایمان کی درستگی و پختگی کا طریقہ اور علاج بھی پڑھ لیجیے:

(۱) پہلی ضروری بات تو یہ ہے کہ ایمان وعقیدے کا ضروری علم سیکھا جائے، اسلامی عقائد وایمانیات کو اچھی طرح ذہن نشین کیا جائے۔

(۲) کثرت سے ذکر وعبادات، اچھے اخلاق، نیک اعمال اور خیر کے کاموں کو اختیار کریں۔

(۳) برے کاموں اور گناہوں، بد نظری، بے حیائی، بخل، بے رحمی، ظلم وزیادتی، جھوٹ، خیانت، گالی گلوچ، برے اخلاق، تکبُّر اور حسد وغیرہ سے سخت پرہیز کریں۔

## تنبیہ

یاد رہے کہ جس طرح صحیح و مضبوط ایمان اور صحت مند دل سے اچھے اعمال اور اچھے اخلاق وجود میں آتے ہیں اور نیک اعمال اور حسنِ اخلاق، ایمان کے نتائج و ثمرات ہیں، اسی طرح دل کی صحت، ایمان کے رسوخ، پختگی اور نورِ ایمان کو بڑھانے کے لیے نیک اعمال اور اچھے اخلاق کو تکلُّف کے ساتھ اختیار کرنا اور برے کاموں اور گناہوں سے پرہیز کرنا از حد

ضروری ہے کیونکہ نیک اعمال، اچھے اخلاق اور ذکر وعبادت سے نورِ ایمان بڑھتا ہے اور مضبوط ہوتا رہتا ہے جبکہ اس کے برعکس بے عملی، بد عملی، برے کاموں، گناہوں، خیانت اور جھوٹ وغیرہ سے عقائد وایمان کا نور اور قوت کمزور ہو جاتی ہے، بلکہ گناہوں کی کثرت کی وجہ سے بعض اوقات نورِ ایمان ختم ہو جاتا ہے اور ایمانی قوت نیست ونابود ہو جاتی ہے۔

(۴) ایمان کی درستگی اور پختگی کے لیے مؤمن اور پرہیز گار لوگوں کی صحبت کو اختیار کیا جائے اور غلط کاروں، جھوٹوں، خائنوں اور دیگر بری صحبتوں سے پرہیز کیا جائے۔

## عقائد کی اقسام یا درجات

عقائد کی بڑی بڑی قسمیں یا درجات چار ہیں:

(۱) عقائد کی پہلی قسم یا پہلا درجہ وہ ہے جس میں بنیادی اور اصولی عقائد شامل ہیں، ان کو اُمّہات العقائد بھی کہتے ہیں، یہ وہ عقائد ہیں جن کا ثبوت بھی یقینی ہو (یعنی وہ یقینی ذرائع سے ہم تک پہنچے ہوں) اور پھر ان کے معنی بھی اس قدر واضح اور صاف ہوں کہ ان میں کسی قسم کا ابہام اور تاویل کی گنجائش نہ ہو یعنی وہ عقائد جو رسول اللہ ﷺ (قرآن وحدیث) سے ایسے قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہیں جن کے ثبوت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور ان کے معنی بھی اس قدر واضح ہیں کہ ان میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہیں اور ہر دور میں ان کو ایسا تواتر اور ایسی عام شہرت حاصل رہی ہے کہ دین سے معمولی واقفیت رکھنے والے عام مسلمان بھی ان سے واقف ہیں۔

## اُمّہات العقائد تین ہیں

(۱) توحید پر ایمان۔ (۲) رسالت پر ایمان۔ (۳) آخرت پر ایمان۔

یا یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان، سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان اور آخرت پر ایمان۔

یہ تین عقائد باقی تمام ضروری عقائد کے لیے اصولی اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور تمام انبیا علیہم السلام جس دین اور جس دستورِ حیات کا پیغام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اس کا پورا نظام انہی تین عقائد پر قائم ہے اور وہی شخص دینی طرز زندگی کو اختیار کر سکتا ہے جس کے دل میں یہ عقائد رچ بس جائیں، انہی عقائد سے باقی تمام عقائد بھی نکلتے ہیں اس لیے ان کو امہات العقائد بھی کہتے ہیں۔

## ضروری عقائد یا ضروریاتِ دین

(۲) عقائد کی دوسری قسم کو ضروری عقائد اور ضروریاتِ دین بھی کہا جاتا ہے۔

ان عقائد میں اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) پر ایمان لانا، فرشتوں پر ایمان لانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں بہت سے نبیوں کے آنے پر ایمان لانا، ختمِ نبوت پر ایمان رکھنا، اس طرح نماز اور روزہ وغیرہ احکام کی فرضیت پر ایمان رکھنا، سود، شراب اور زنا وغیرہ حرام چیزوں کی حرمت پر ایمان رکھنا، جنت و دوزخ کو ماننا اور حساب کتاب کے لیے پیش ہونے کو ماننا۔

اس طرح کی وہ تمام باتیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہیں اور ان کے معنی بھی واضح ہیں جیسا کہ توحید و رسالت اور آخرت کا ثبوت اور وضاحت، ان سب باتوں کا حکم بھی یہی ہے کہ ان میں سے کسی ایک بات کا انکار کر کے بھی آدمی مسلمان نہیں رہ سکتا اگرچہ اس کا یہ انکار کسی تاویل کی آڑ میں ہو۔

## ضروری عقائد سے کم درجے کے عقائد

(۳) تیسری قسم یا تیسرا درجہ ان عقائد کا ہے جو ضروری عقائد سے کم درجے کے عقائد ہیں جن کا ثبوت پکا اور قابلِ اطمینان ہو اور ان کے معنی بھی واضح ہوں، لیکن اس درجہ کے قطعی

اور یقینی نہیں جس کے بعد کسی احتمال یا تاویل کی گنجائش نہیں رہتی۔

اس تیسری قسم اور درجہ کے عقائد میں عذابِ قبر، آخرت کی بعض تفصیلات مثلاً شفاعت وغیرہ، قیامت سے پہلے دجال کا ظہور اور علاماتِ قیامت شامل ہیں۔

ان عقائد کا ثبوت رسول اللہ ﷺ سے اگرچہ پکا اور قابلِ اطمینان ہے، لیکن ضروریاتِ دین اور ضروری عقائد کے معیار کا نہیں اس لیے کسی شبہ یا کسی تاویل کی بنیاد پر ان میں سے کسی چیز کا انکار اگرچہ سخت گمراہی ہے، لیکن اس کی وجہ سے کسی کو کافر یا مرتد نہیں کہا جاسکتا، البتہ ان میں سے بعض کا ثبوت بعض کے مقابلہ میں کم درجہ رکھتا ہے، اس لحاظ سے ان میں بعض کا انکار بدترین گمراہی ہے اور بعض اس کی نسبت کم مثلاً عذابِ قبر سے انکار کی گمراہی بدترین گمراہی ہے جس کی سرحدیں کفر سے جاملتی ہیں اور اس کی بہ نسبت دجال کے ظہور سے انکار کم درجہ کی گمراہی ہے۔ غرض اس تیسرے درجے کے عقائد میں گمراہی کے درجات مختلف ہیں۔

## نظریات یا اختلافی مسائل

(۴) عقائد کی چوتھی قسم یا چوتھا درجہ نظریات اور اختلافی مسائل کا ہے، یہ وہ نظریات اور مسائل ہیں جن کے بارے میں ایک سے زیادہ رائے ہوسکتی ہیں یا تو اس وجہ سے کہ ان کے بارے میں آنے والی آیتوں یا حدیثوں میں بظاہر ٹکراؤ ہوتا ہے یا ان کے بارے میں آنے والے الفاظ اور مضمون کے ایک سے زائد معنی ہوسکتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن نظریات کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا تابعین رحمہم اللہ یا تبع تابعین رحمہم اللہ کے دور سے اختلاف چلا آرہا ہو مثلاً سماعِ موتیٰ (مُردوں کا سننا)، بعض علما مُردوں کے لیے سلام وغیرہ کے سننے کو ثابت کرتے ہیں اور بعض مردوں کے سننے کی نفی

کرتے ہیں، اس قسم کے نظریات اور اختلافی مسائل چونکہ اجتہادی ہوتے ہیں جن میں دونوں طرف خطا وصواب کا احتمال موجود ہوتا ہے اور ان پر فلاح ونجات کا دارومدار بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے ایسے نظریات ومسائل میں دلائل کی بنیاد پر کسی ایک مجتہد یا عالم کی رائے کو ترجیح تو دی جاسکتی ہے، مگر ایسے نظریات ومسائل کے ماننے یا نہ ماننے والوں دونوں میں سے کسی کو گمراہ یا فاسق اور مشرک وغیرہ کہنا درست نہیں۔

## اسلام کے معنی

اسلام کے اصل معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے سپرد اور حوالے کر دینا اور بالکل دل وجان سے اس کے تابع فرمان ہو جانا، اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کے لائے ہوئے دین کا نام "اسلام" اس لیے ہے کہ اس میں بندہ اپنے آپ کو بالکل اللہ رب العالمین کے حوالے اور سپرد کر دیتا ہے اور دل وجان سے اس کی بندگی اور مکمل اطاعت کو اپنا دستورِ زندگی قرار دیتا ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اور ہر پہلو سے اللہ تعالیٰ کا مطیع اور تابع فرمان بن جاتا ہے۔ اسلام کی اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْناً مِمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ

"اور اس سے بہتر کس کا دین ہوگا جس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کیا اور وہ نیکوکار ہو۔" (النساء:۱۲۵)

مطلب یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر اور بہترین کس کا دین ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو کامل ومکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور اپنے پورے وجود، تن، من، دھن کے ساتھ اس کے اور اس کی ہدایات وتعلیمات کی طرف یکسو ہو کر رہے، ساتھ ساتھ وہ اپنے رب کی ہر ہدایت اور حکم کی تعمیل اس طرح کرے جس طرح اس کے ادا کرنے کا حق ہوتا ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا

”پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے لہٰذا تم اپنے آپ کو (پوری طرح) اسی ہی کے حوالے کردو۔“ (الحج:۳۴)

## کلمہ اسلام کے حقوق

اسلام اور ایمان کا بنیادی کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کو مان کر اقرار کرنا ہے۔ اس کلمہ کے چھ حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں:

(۱) کلمہ کے الفاظ درست تلفُّظ سے ادا کرنا۔

(۲) کلمہ کا معنی جان لینا۔

(۳) کلمہ کے مطلب اور مفہوم کو سمجھ لینا۔

(۴) کلمہ کے مطابق اپنی پوری زندگی گزارنا۔

(۵) اس کلمہ کے مخالف قوانین اور غیر اللہ کی بندگی سے دل وجان سے بے زار اور متنفر ہونا۔

(۶) اس کلمہ کو غالب اور بلند کرنے کے لیے جان ومال سے جدوجہد اور جہاد کرنا۔

## کلمہ اسلام کے حقوق کی تشریح

(۲) کلمہ کے معنی: کلمہ کے معنی یہ ہیں کہ ”اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں، محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بندگی کے سیکھنے کا واحد ذریعہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر محمد ﷺ ہیں۔

## کلمہ کا مفہوم

(۳) کلمہ کا مفہوم واضح ہے کہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں گے اور یہ بندگی محمد رسول اللہ ﷺ سے سیکھی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کے جملہ احکامات وہدایات قرآن مجید میں موجود ہیں اور اس کی قولی و عملی تشریح نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور آپ ﷺ کی عملی زندگی، طرزِ زندگی اور سنتِ رسول اللہ ﷺ میں موجود اور محفوظ ہے۔

## کلمہ کے مطابق زندگی

(۴) ظاہر ہے کہ اب اس اقرار اور عہد کے بعد اس عہد کو پورا کرنا ہوگا اور وہ یہ کہ اپنی زندگی قرآن مجید اور سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق گذارنا اور اس عہد وپیماں کو پورا کرنا ہوگا۔

کلمہ اسلام کا یہی عملی پہلو اس کا اہم فریضہ ہے جو خود بندہ کے اقرار میں موجود ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کرے گا اور بندگی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ سے سیکھ کر اس کے مطابق پوری زندگی گذارے گا، کیونکہ نبی کریم ﷺ کو اسی لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی بندگی سکھائیں، سمجھائیں اور خود کرکے دکھائیں، قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے بار بار اس بات کی تاکید فرمائی ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ

”اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔“ (النساء:۵۹)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

”اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو صرف اس لیے بھیجا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔“ (النساء:۶۴)

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

”اور جس نے اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔“
(النساء:۸۰)

نیز نبی کریم ﷺ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ

”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اسی ہدایت و تعلیم کے تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔“ (مشکوٰۃ)

## مخالف قوانین اور غیر اللہ کی بندگی سے بے زاری

(۵) اس عظیم کلمہ میں اس بات کا عہد وپیمان اور اقرار بھی موجود ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی نہیں کریں گے، جو قانون، جو حکم اور بات اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کے حکم کے خلاف ہو یا اس کے رسول ﷺ کے ثابت شدہ طریقے سے متصادم ہو اس کا انکار کریں گے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ
اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا

”پس جو شخص (اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون کے باغی) سرکش کا انکار کرے اور اللہ تعالیٰ (کے قانون اور احکامات کی صداقت) پر ایمان لائے تو اس نے مضبوط حلقہ (یعنی سہارا) پکڑ لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔“ (سورۂ بقرہ:۲۵۶)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اَلَم تَرَ اِلَى الَّذِينَ يَزعُمُونَ اَنَّهُم اٰمَنُوا بِمَآ اُنزِلَ اِلَيكَ وَ مَآ اُنزِلَ مِن قَبلِكَ يُرِيدُونَ اَن يَّتَحَاكَمُوٓا اِلَى الطَّاغُوتِ وَقَد اُمِرُوٓا اَن يَّكفُرُوا بِهٖ ؕ وَيُرِيدُ الشَّيطٰنُ اَن يُّضِلَّهُم ضَلٰلًا بَعِيدًا ﴿٦٠﴾

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتاری گئی اور اس پر بھی جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے اور (اس کے باوجود) وہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے (اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون کے خلاف) سرکش کے پاس لے جائیں حالانکہ ان کو (کلمہ طیبہ اور قرآن مجید میں) حکم دیا گیا ہے کہ اس سرکش طاغوت کا انکار کریں (اور اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف کسی قانون کو نہ مانیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے لیے لازم ہے کہ طاغوت کا انکار کیا جائے، بغیر اس انکار کے نہ ایمان معتبر ہے اور نہ خالص بندگی ممکن ہے، لیکن یہ کمزور اور ڈانواں ڈول لوگ ان دونوں کو جمع کرنا چاہتے ہیں حالانکہ یہ ایک شیطانی چال ہے) اور شیطان چاہتا ہے کہ (اس طرح وہ) ان کو (صراطِ مستقیم اور خالص بندگی کی راہ سے بھٹکا کر) نہایت دور کی گمراہی میں ڈال دے (تاکہ پھر ان کے لیے اس راہِ حق کو پانے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے)۔" (النساء:٦٠)

ان آیتوں سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کے لیے یہ لازمی ہے کہ طاغوت یعنی دینِ اسلام کے خلاف قوانین سے انکار کیا جائے۔

## کلمۂ اسلام کو غالب اور بلند کرنے کے لیے جدوجہد اور جہاد

(٦) کلمہ طیبہ ایک عہد وپیماں اور ایک سودا ہے، اس میں انسان کامل طور پر اپنے مال وجان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون کے حوالے کرتا ہے، وہ اپنی کمائی اور اپنے اعضا میں

آزاد نہیں ہوتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر کمائی کرتا ہے اور اپنی کمائی اپنے اعضا آنکھ، کان وغیرہ کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق استعمال کرتا ہے، اپنی پوری قوت اور پورے زور کے ساتھ اپنی مالی جانی توانائیاں اللہ تعالیٰ کی راہ یعنی دینِ اسلام کے قیام وبقا اور حفاظت کے لیے قربان کرتا ہے، وہ اپنی کمائی اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کر کے کفر اور باطل کے خلاف پوری قوت سے جنگ کرے گا قرآن مجید اور احادیث میں اس کے دلائل بکثرت موجود ہیں، یہاں بطورِ نمونہ چند دلائل پیش کرتا ہوں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

"اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر حالانکہ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔" (سورۂ بقرہ:۸)

دوسری جگہ مؤمن کی نشان دہی کر کے فرماتے ہیں کہ:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝

"مؤمن تو بس وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر (علی وجہ البصیرت) ایمان لائے (اس طرح کا ایمان کہ) پھر انہوں نے (ذرہ برابر بھی) شک نہیں کیا اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ تعالیٰ (کے دینِ حق کے قیام) کے راستے میں (مسلسل جدوجہد اور) جہاد کیا، یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں (اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو سچائی کے پیکر بن کر فلاح پاتے ہیں)۔" (الحجرات:۱۵)

سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ دوٹوک الفاظ میں نبی کریم ﷺ سے اعلان کرواتے ہیں:

قُل اِن كَانَ اٰبَآؤُكُم وَاَبنَآؤُكُم وَاِخوَانُكُم وَ اَزوَاجُكُم وَعَشِيرَتُكُم وَاَموَالُ ۨاقتَرَفتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخشَونَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرضَونَهَآ اَحَبَّ اِلَيكُم مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُولِهٖ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهٖ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَاتِيَ اللّٰهُ بِاَمرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهدِي القَومَ الفٰسِقِينَ ﴿۲۴﴾

"(اے پیغمبر ان سے) کہو کہ اگر تمہارے آبا(واجداد)اور تمہارے بیٹے (اور پوتے) اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ (چلتی ہوئی) تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو (یہ سب) تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس (کے دین کے قیام) کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (یعنی عذاب وزوال) بھیج دے (ظاہر ہے کہ جب ان چیزوں کی محبت غالب ہوگی تو جہاں بھی یہ چیزیں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور دینِ حق کی راہ میں آئیں گی تو ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے احکامات، رسول اللہ ﷺ کی سنتوں اور راہِ حق میں جدوجہد اور جہاد سے بے وفائی، نافرمانی اور غداری کے ارتکاب اور فسق کو اختیار کیا جائے گا) اور اللہ تعالیٰ (ایسے) فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

(سورۂ توبہ ۲۴)

نیز اسی سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ اشتَرٰى مِنَ المُؤمِنِينَ اَنفُسَهُم وَ اَموَالَهُم بِاَنَّ لَهُمُ الجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقتُلُونَ وَ يُقتَلُونَ

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے ان کے مال اور جان اس قیمت پر خرید لیے ہیں کہ ان کے لیے (دنیا میں دلی اور معاشرتی جنت اور آخرت میں ابدی) جنت ہے (اور یہ مؤمن لوگ

اللہ تعالیٰ کی راہ میں اسلام کے قیام کے لیے مسلسل اپنے مال وجان سے جدوجہد کرتے ہیں اور جب ضرورت پڑتی ہے تو باطل اور کفر کے خلاف میدانِ جنگ میں کود پڑتے ہیں اور) اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد اور قتال کرتے ہیں پھر (حق کے منکروں کو) مارتے ہیں اور (خود بھی) مارے جاتے ہیں۔" (توبہ:۱۱۱)

اس آیتِ کریمہ میں صاف صاف بتادیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیعت اور ہر مؤمن جولا الٰہ اِلا اللہ کا اقرار کرے وہ اس بات کی بیعت اور معاہدہ کرتا ہے کہ اس نے اپنا مال، اپنی جان اور اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون وحکم کے حوالے اور سپرد کی، اس کے بدلے مؤمن کو اطمینان والا دل، اطمینان والی زندگی اور پر سکون جنتی معاشرہ ملے گا اور آخرت میں اس کے لیے ابدی ترقیات اور جنت ہوگی۔

یادرہے کہ "مال وجان اللہ تعالیٰ کی راہ میں دینا" دراصل اس کامل حوالگی اور سپردگی سے تعبیر ہے جس کا بیان پہلے گذرچکا ہے۔

کامل حوالگی اور سپردگی کے بغیر قلبی سکون واطمینان، معاشرتی حقیقی خوشحالیاں اور آخرت کی ابدی نعمتیں وترقیاں نہیں مل سکتیں۔ یہاں حوالگی اور سپردگی کو مال وجان سے اس لیے تعبیر کیا تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ اقرار اور معاہدہ صرف ذہنی اور اعتقادی ہے، بلکہ اس اقرار اور معاہدہ میں مؤمن اپنی جان، اپنی پوری توانائیاں اور کمائیاں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق استعمال کرے گا اور اس کی راہ میں قربان کرنے کے لیے پیش کرے گا۔ یا اللہ تو ہی ہمارے مال وجان اپنی راہ میں قبول فرما۔

## اہل سنت والجماعت کے متفقہ عقائد کا خلاصہ

(۱) اللہ تعالیٰ کو یکتا ماننا، ذات وصفات میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا اور نہ اس کے

اختیارات اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر ایمان لانا۔

(۳) اس کی نازل کردہ تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا اور قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی آخری، ابدی، کامل اور مکمل کتاب ماننا۔

(۴) قرآن مجید اور اس کے بیان سنت و حدیث کو حُجّت ماننا۔

(۵) نبی کریم ﷺ اور ان سے پہلے آنے والے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا، نبی کریم ﷺ کو آخری اور پورے عالم کے لیے تا قیامت نبی ماننا اور آپ ﷺ کے بعد ہر مدعی نبوت کو بلا طلب دلیل کذّاب، جھوٹا (کافر) اور دجّال سمجھنا اور اس کے پیروکاروں کو بھی کافر سمجھنا۔

(۶) تمام انبیا علیہم السلام انسان ہوتے ہیں، انسانیت ان کا شرفِ کمال ہوتا ہے، اس مبارک جماعت کو انسانیت کی حد سے نکالنا یا تو ان کی توہین ہے یا شرک۔ البتہ بلاشبہ وہ انسان ہوتے ہوئے بھی اپنے بشری کمالات میں تمام انسانوں سے اعلیٰ اور ممتاز ہوتے ہیں۔

(۷) تقدیر کا عقیدہ رکھنا یعنی اچھی ہو یا بری سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ماننا۔

(۸) روزِ آخرت پر ایمان رکھنا، حساب و کتاب، میزان، پلِ صراط، جنت و دوزخ اور نصوصِ قطعیہ سے ثابت شدہ ان کی تمام تفصیلات کو حق ماننا۔

(۹) مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے، حشر اور شفاعت وغیرہ امور پر یقین رکھنا۔

(۱۰) نبی کریم ﷺ کے سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ بیت عظام رضی اللہ عنہم یعنی ازواجِ مطہّرات اور ذریتِ طیبہ کو عادل ماننا۔

اس مبارک جماعت کو معیارِ حق ماننا اور جن مسائل پر ان کا اجماع و اتفاق ہو چکا

ہے ان کو واجب الاتباع ماننا، ان کے ساتھ محبت کو دلیلِ ایمان اور ان کے ساتھ بغض و عناد کو دلیلِ کفر و نفاق سمجھنا اور ان پر تنقید سے کامل احتراز کرنا۔

(۱۱) مُعجِزات اور کرامات کو حق ماننا۔

(۱۲) عذابِ قبر اور انعاماتِ قبر کو حق ماننا۔

(۱۳) قبور مبارکہ میں انبیا علیہم السلام کے لیے دوسرے لوگوں سے ممتاز اور اعلیٰ درجہ کی حیات ماننا۔

(۱۴) سماع موتیٰ کو سلف کے درمیان مختلف فیہ مسئلہ سمجھتے ہوئے جانبین کو محتمل الصواب سمجھنا اور اس طرح کے دوسرے اختلافی مسائل میں راہِ اعتدال اختیار کرتے ہوئے اقرب الی الحق کو قبول کر کے دوسرے فریق پر کفر، شرک یا بدعت و ضلالت کے حکم لگانے سے اجتناب کرنا۔

(۱۵) نیز اس قسم کے مسائل کی آڑ میں شرکیات و بدعات سے اور انبیا علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضرات اولیاء کرام رحمہم اللہ کی گستاخی واہانت سے بچنا اور بچانا۔

(۱۶) جتنے امور قطعی نصوص سے ثابت ہیں انہیں حق ماننا اور ان میں سے کسی بھی چیز کے انکار کو کفر سمجھنا اگرچہ یہ انکار تاویل کے ساتھ ہو۔

## ایمان کا خلاصہ

ایمان کے اصل معنی کسی کے اعتماد پر کسی بات کو سچ ماننے کے ہیں اور دین کی خاص اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا سچا اور آخری رسول و نبی مانا جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حقیقتیں اور جو ہدایات و احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتائے اور پہنچائے ہیں ان سب باتوں کو حق اور سچ مان کر صدقِ دل سے قبول کیا جائے۔ یعنی رسول

کریم ﷺ کی اطاعت واتباع کو اپنے اوپر لازم کر لیا جائے۔

اگر نبی کریم ﷺ کی نبوت پر یقین ہو مگر آپ ﷺ کو مانے نہیں یا یقین کے ساتھ محبت بھی ہو پھر بھی نہ مانے تو ایسا آدمی بھی مؤمن نہیں ہو سکتا۔

ایمان کے لیے ضروری ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا سچا نبی ورسول یقین کر کے مانا جائے اور آپ کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم سمجھا جائے۔

## کفر کی تعریف

ایمان کی تعریف اور خلاصہ سمجھنے کے بعد اب کفر کی تعریف اور خلاصہ پڑھ لیجیے:

کفر کے لفظی معنی انکار اور چھپانے کے ہیں ناشکری کو بھی کفر اس لیے کہتے ہیں کہ محسن کے احسان کو چھپانا اور اس کے احسان کا انکار کرنا ہے" اور شریعت کی اصطلاح میں کفر ایمان کی ضد ہے اور کفر کی تعریف یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم خاتم الانبیا والمرسلین محمد ﷺ پر نازل ہوا ان سب کا انکار کرنا یا ان میں سے کسی بھی ایک چیز کا انکار کرنا بشرطیکہ وہ چیز یقینی طور پر ثابت ہو"۔ مثلاً ایک شخص دینِ اسلام کے تمام عقائد اور احکامات وتعلیمات کو حق جانتا ہے اور مانتا ہے مگر صرف فرشتوں کے وجود کا منکر ہے یا صرف تقدیر کا منکر ہے یا صرف ختمِ نبوت کا منکر ہے یا صرف نماز کی فرضیت کا منکر ہے یا صرف سود کی حرمت کا منکر ہے یا فریضۂ جہاد کا منکر ہے یا شرعی احکامات پر تنقید کرے یا اسلامی شعائر کی توہین کرے یا ان کا مذاق اڑائے یا شرعی سزاؤں کو ظالمانہ اور وحشیانہ کہے تو ایسا شخص دائرۂ اسلام سے خارج اور کافر ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ دینِ اسلام کی یقینی بات یا حکم کا انکار کرنا یا اس کو تبدیل کرنا یا اس پر تنقید کرنا یا اس کی توہین کرنا یا اس کا مذاق اڑانا کفر ہے اور ایسے شخص کا ٹھکانا جہنم ہے۔

## نفاق کسے کہتے ہیں؟

نَفَقٌ سرنگ کو کہتے ہیں۔ اور النَّافِقَاءُ جنگلی چوہے کے بل کے متعدد سوراخوں میں سے ایک سوراخ کو کہتے ہیں جس کے اوپر وہ مٹی کا باریک سا پردہ بنالیتا ہے تاکہ پتہ نہ چلے کہ یہاں کوئی سوراخ ہے جب اس کا دشمن اس کو اس کی ظاہری آمدورفت کے سوراخ سے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سر مار کر اس دوسرے راستے سے بھاگ جاتا ہے اس لیے اس شخص کو منافق کہا جاتا ہے جو کسی جماعت یا کسی دین وغیرہ میں داخل ہونے سے پہلے اس سے باہر نکلنے کا راستہ بھی بنا کر اس پر مکر وفریب کا پردہ ڈال دیتا ہے، پھر جب کوئی آزمائش یا سختی آئے تو ایسی حالت میں وہ اس دین یا جماعت کو چھوڑ دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ مِنَ النَّاسِ مَن يَّعبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرفٍ ۚ فَاِن اَصَابَهٗ خَيرُ ۨ اطمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَ اِن اَصَابَتهُ فِتنَةُ ۨ انقَلَبَ عَلٰى وَجهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنيَا وَ الاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الخُسرَانُ المُبِينُ ﴿۱۱﴾

”اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بندگی ایک کنارے پر رہ کر کرتے ہیں پس اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچا تو اس کا دل اس پر مطمئن (اور جما ہوا) ہوتا ہے اور اگر کوئی آزمائش پیش آگئی تو الٹا پھر گیا اس نے دنیا بھی کھودی اور آخرت بھی، یہی کھلا ہوا خسارہ ہے۔“ (حج:۱۱)

مطلب یہ کہ سچا مؤمن تو وہ ہے جس کے دل ودماغ پر دین پوری طرح چھا گیا ہو، وہ کسی تحفّظ کے بغیر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے حوالے کر دیتا ہے اور دینِ اسلام کو پوری طرح اپنا لیتا ہے اور بعض لوگ وہ ہیں جو حق وباطل دونوں سے تعلق کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، ایسے لوگ دین کو صرف ظاہری جذبہ کے ساتھ مانتے ہیں، ان کی حقیقی دلچسپیاں

اپنے دنیاوی مفادات سے وابستہ ہوتی ہیں، اور ان کا یہ تعلق صرف اس وقت تک کے لیے ہوتا ہے جب تک دین کو اختیار کرنے سے انہیں کوئی نقصان نہ ہو رہا ہو اور ان کے مفادات پر کوئی زد نہ پڑتی ہو، لیکن جب کوئی آزمائش پیش آتی ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ دین اور ان کے دنیاوی مفادات دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تو ایسی صورت میں وہ دین اور دین کے احکامات سے بھاگ جانے کا راستہ تلاش کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو منافقین کہا جاتا ہے اور منافق کی دنیا وآخرت دونوں برباد ہو جاتے ہیں، وہ نہ تو دنیا کی حقیقی کامیابی اور عزت کو پاسکتے ہیں اور نہ آخرت کی کامیابی ان کے ہاتھ آسکتی ہے، ان کی دنیا کی زندگی بھی بے چین اور بے اطمینان ہوتی ہے اور آخرت میں بھی دائمی طور پر سخت عذاب سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

بہر حال عربی زبان میں نفاق کا شمار مکر وفریب کے جنس میں ہوتا ہے یعنی ظاہر میں خیر کا اظہار اور باطن میں اس کے خلاف جذبات رکھنا۔

## نفاق کی قسمیں

نفاق کے اصل معنی ہیں ظاہر کا باطن سے مخالف ہونا یعنی ظاہر میں خیر وصلاح کا اظہار ہو اور باطن میں اس کے برعکس جذبات ہوں۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

## نفاق فی العمل

(۱) اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد بظاہر خوب روزے، نمازیں، نوافل اور پارسائی کا اظہار ہو، مگر وہ اپنے ان نیک اعمال وکردار میں ریاکاری کرتا ہو، اس کا نام نفاق فی العمل ہے یعنی عقیدہ میں نفاق نہیں مگر عمل میں نفاق اور ریاکاری ہو، اس کا مشہور ومعروف نام ریاکاری ہے اور اس کا پورا بیان ''ریاء'' کے باب میں دیکھ لیجیے۔ [۱]

---

(۱) جو کہ ایمانی صفات اخلاص کے بیان میں موجود ہے۔ زین

## اعتقادی نفاق

(۲) اعتقادی نفاق یعنی عقیدہ کی رو سے نفاق ہو اور یہی حقیقی نفاق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان زبان سے اسلام کا دعویٰ کرے اور اس کا ظاہری عمل بھی اسلام کے مطابق ہو مگر دل سے اسلام کا انکار کرے، اسلام کے بارے میں شک وتذبذب کا شکار ہو، یعنی اس نے دل سے اسلام قبول نہ کیا ہو لیکن کسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مؤمن اور مسلم ظاہر کرتا ہو، ایسا شخص بدترین کافر ہوتا ہے ایسا شخص جہنم کے سب سے نچلے سب سے زیادہ ہیبت ناک اور سب سے زیادہ المناک درجے میں ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ

"بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔" (النساء:۱۴۵)

## عملی منافق

(۳) عقیدہ صحیح ہو دل سے اسلام کو قبول کر چکا ہو مگر اس کا کردار اسلام کے مطابق نہ ہو اس کو خاص اصطلاح میں عملی نفاق کہا جاتا ہے یعنی کردار کی رو سے نفاق کا شکار ہوتا ہے۔ مثلاً جھوٹا طرزِ عمل اپناتا ہو، جو شخص ایسے طرزِ عمل کو اختیار کرتا ہے اس کو عملی منافق کہا جاتا ہے یہ اگرچہ کفر نہیں مگر فسق ہے، ایسے شخص کو کافر تو نہیں، لیکن فاسق کہا جاتا ہے ایسا شخص قابل گرفت ہے، بلکہ بداعمالیوں کی وجہ سے اس کے برے خاتمہ کا خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں دنیا سے کافر اور بے ایمان نہ چلا جائے۔

## منافق کی نشانیاں

اب یہاں منافق کی چند نشانیوں کا ذکر کرتے ہیں جس سے منافق اعتقادی اور منافق عملی کے خدوخال سامنے آئیں گے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اٰيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ

''منافق کی نشانیاں تین ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔'' (بخاری و مسلم)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''علمانے لکھا ہے کہ یہ حدیث ''جوامع الکلم'' میں سے ہے اعمال انسانی کے تین درجے قول وفعل ونیت اگر درست ہو جائیں تو پھر اب کیا باقی رہا، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ سے قول کے فساد پر دلالت ہوتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد وَاِذَ اؤْتُمِنَ خَانَ سے فسادِ فعل پر تنبیہ ہوتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد............ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ سے فسادِ نیت کی نشاندہی ہوتی ہے اس لیے وعدہ خلافی کی مذمت اس وقت نہیں کی جاسکتی جب تک کہ وعدہ کے ساتھ وعدہ خلافی کا عزم بھی نہ کیا گیا ہو۔۔۔۔۔۔۔''

(فضل الباری: ۱/۴۴۳)

حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''الغرض ایک نفاق تو ایمان اور عقیدے کا ہے جو کفر کی بدترین قسم ہے لیکن اس کے علاوہ کسی شخص کی سیرت کا منافقوں والی سیرت ہونا بھی ایک قسم کا نفاق ہے مگر وہ عقیدہ کا نہیں، بلکہ سیرت اور کردار کا نفاق ہے اور ایک مسلمان کے لیے جس طرح یہ ضروری ہے کہ کفر وشرک اور اعتقادی نفاق کی نجاست سے بچے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ منافقانہ سیرت اور منافقانہ اعمال واخلاق کی گندگی سے بھی اپنے کو محفوظ رکھے۔''

(معارف الحدیث: ۱/۱۵۷-۱۵۸)

## نبی کریم ﷺ کے بعد حقیقی منافق کی پہچان کیسے ہو گی؟

نبی کریم ﷺ پر وحی اترتی تھی اور اللہ تعالیٰ ہی آپ ﷺ کو اعتقادی منافقین کی نشان دہی فرماتے تھے، آپ ﷺ پر نبوت ورسالت اور وحی کا سلسلہ ختم ہوا اس لیے آپ ﷺ کے بعد کسی کے بارے میں یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بظاہر مسلمان اور اندر سے کافر ہے کیونکہ ایمان و عقیدہ کا تعلق انسان کے دل سے ہے اور دل کی حالت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اس لیے دعویٰ اسلام کے ہوتے ہوئے جب تک واضح کفریہ اعمال کا مرتکب نہ ہو چکا ہو اس وقت تک کسی کو اعتقادی اور حقیقی منافق کہنا درست نہیں، البتہ اعتقادی منافق کی پہچان کی ایک صورت یہ ہے کہ اس سے ایسی کفریہ باتیں یا اعمال صادر ہو جائیں جو اس کے اندرونی کفر اور اسلام سے بغاوت کی پوری غمازی کرتے ہوں لیکن ایسی صورت میں اس کو منافق کے بجائے کافر اور زندیق یا مرتد کہا جائے گا۔

## کفریہ الفاظ اور اعمال کے چند نمونے

کفریہ الفاظ اور اعمال کے چند نمونے یہ ہیں:

(۱) مثلاً بغیر جبر و اکراہ کے عقل و ہوش کے ساتھ قصداً بتوں کو سجدہ کرے۔

(۲) دین سے لگی ہوئی چیزوں اسلامی احکامات یا نبی کریم ﷺ کے بارے میں عقل و ہوش رکھتے ہوئے قصداً گستاخی کرے مثلاً اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ کہے وغیرہ۔

(۳) اسلامی فرائض اور یقینی ہدایات و احکامات میں سے کسی ایک حکم یا ہدایت کا انکار کرے۔

(۴) اسلامی احکامات و فرائض کا مذاق اڑائے۔

ایسے تمام اشخاص کافر اور زندیق ہوں گے اور یہ کفریہ اور بغاوت پر مبنی اعمال اور باتیں ان کے کفر کی پوری طرح غمازی کرتی ہیں۔

جس طرح یہ جائز نہیں کہ کسی گناہ کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر کہا جائے اسی طرح ایسے مارِ آستین لوگوں کو مسلمان کہنا بھی جائز نہیں، ایسے لوگ پکے کافر اور اسلام کا نام لے کر اسلام کے منکر اور اسلام کا مذاق اڑانے والے ہوتے ہیں۔

## شرک کسے کہتے ہیں؟

شرک اور شراکت لغت میں خلط ملط ہو جانے، اور مشرک شریک بنانے والے کو کہا جاتا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کی آسان تعریف اور خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، اس کے ساتھ مخصوص اختیارات، اس کی عبادت اور حقوق میں کسی کو شریک اور حصہ دار سمجھنا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنے والے کو مُشرِک کہا جاتا ہے۔

## شرک کی ضروری تفصیل

مُشرِک کی یہ تعریف اور خلاصہ ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے اس کی ضروری تفصیل بھی پڑھ لیجیے:

(۱) اللہ تعالیٰ کی ذات میں شرک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کا یا کسی کو اللہ تعالیٰ کا جز قرار دینا یا کائنات میں ایک سے زیادہ خداؤں کو ماننا۔

مثلاً عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کے جوہر سے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے ان کو جنا ہے یا مشرکینِ عرب کا یہ عقیدہ کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور مجوسیوں کا یہ عقیدہ کہ خیر کا خدا الگ ہے اور شر کا خدا الگ ہے۔

یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے قدیم ازلی وابدی ہونے اور اللہ تعالیٰ کی ان تمام صفاتِ کمال کے منافی ہیں جن کا ماننا عقل وفطرت اور دینِ اسلام کی رو سے لازم ہے، اس کو شرک فی الذات کہا جاتا ہے اور ایسا شخص بہت بڑا مشرک ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی صفات میں شرک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات جس مفہوم میں اللہ تعالیٰ کے لیے بولی جاتی ہیں اس مفہوم میں ان صفات میں اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذاتی بھی ہیں اور کلی ولا محدود بھی، انسان وغیرہ میں جس قدر کمالات دکھائی دیتے ہیں وہ اس کے ذاتی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ پیدا کرتے ہیں اور پھر مخلوق کی صفات عارضی ہیں اور ساتھ ساتھ جزوی اور محدود بھی ہیں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کا علم اس کا ذاتی ہے، کلی اور ہر چیز پر محیط ولا محدود بھی ہے، اس کے برعکس مخلوق فرشتوں اور انسان وغیرہ کا جو علم ہے وہ عارضی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے اور وہ بھی جزوی طور پر ملتا ہے اور جس قدر اللہ تعالیٰ چاہے اسی قدر علم اور معلومات اس پر کھول دیتے ہیں، اسی طرح ''قدرت'' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے انسان وغیرہ کو جو قوت وقدرت ملتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے اور وہ بھی دائرہ اسباب کی حد تک محدود ہوتی ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ انسان کو دیکھنے، سننے، پکڑنے، سوچ وفکر وغیرہ کی قدرت دیتا ہے لیکن یہ قدرت عارضی ہے، جب اللہ تعالیٰ چاہے سلب کرلیتا ہے اور محدود وجزوی بھی کہ وہ صرف اسباب کو اختیار کرسکتا ہے لیکن اسباب کے نتائج پر کسی کو قدرت اور اختیار حاصل نہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے مخصوص اختیارات میں شرک کرنے کا مطلب ذرا تفصیل طلب ہے وہ یہ کہ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق، مالک اور قادر مطلق ہے، مخلوق نہ کسی چیز کی مالک ہوسکتی ہے اور نہ کسی چیز پر قدرت وملکیت حاصل کرسکتی ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان وغیرہ کو دوسری خصوصیات اور قوتوں سے نوازا ہے، اسی طرح انسان کو

اسباب کے استعمال پر قدرت واختیار بھی عنایت فرمایا ہے اور عارضی طور پر اسباب اس کے حوالے کر کے اس کو مالک بنایا ہے۔ لیکن انسان کی یہ قوت، اختیار اور ملک سب کچھ عارضی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ چاہے وہ اس سے سلب کرلیتا ہے اور اس کی یہ ملک واختیار اور تصرف اسباب کی حد تک محدود ہیں، اللہ تعالیٰ انسان کو دل، زبان اور آنکھ وغیرہ کی قوتوں اور مال مویشیوں وغیرہ کا عارضی مالک بناتا ہے اور ان میں اس کو تصرف کا اختیار بھی دیتا ہے، لیکن جب چاہے اللہ تعالیٰ انسان سے ان چیزوں کو سلب کرلیتا ہے، بلکہ جب چاہے اللہ تعالیٰ اس سے اختیار کی قوت بھی لے لیتا ہے اور بالآخر موت تو ہر شخص پر اس بات کو واضح کردیتی ہے کہ انسان کے پاس سب کچھ عارضی تھا، پھر انسان اسباب میں صرف تصرف کا اختیار رکھتا ہے، لیکن نتائج یا نفع ونقصان کا کوئی اختیار اس کے پاس نہیں ہوتا، وہ ہاتھ پاؤں مار کر فصل تو کاشت کرلیتا ہے لیکن اس کا نتیجہ اور پھل اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہوتا ہے، وہ غلط یا اچھا کام تو کر سکتا ہے لیکن اس کے نتائج اور ثواب وعذاب اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہوتا ہے، وہ نفع ونقصان کے اسباب کو تو اختیار کر سکتا ہے لیکن نفع ونقصان اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے انسان کو اللہ تعالیٰ نے دل وزبان تو دے دی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے درخواست و دعا تو کر سکتا ہے، لیکن اس کا قبول کرنا اور رد کرنا صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ انسان کو دنیاوی اسباب کا عارضی ملک اور ان میں تصرف کا اختیار تو حاصل ہے لیکن وہ اسباب سے بالاتر کسی چیز کی ملک واختیار نہیں رکھتا۔

نفع ونقصان، خیر وشر پیدا کرنے، کامیابی وناکامی، عزت وذلت کی ملک، تمام عالَم کا انتظام اور اس میں تصرف وغیرہ کے تمام تر اختیارات صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ

مخصوص ہیں، اس نے یہ ملک اور اختیار کسی مخلوق کو نہ کبھی دیا ہے اور نہ دیتا ہے اور نہ دے گا، اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا بھی اس عالَم میں تصرُّف اور اختیار کا قائل ہو یا کسی کو نفع ونقصان کا مالک مانتا ہو تو ایسا شخص مشرک ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کے حقوق یا عبادت میں شریک کرنے کا مطلب: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کمال اور اختیارات کے جو حقوق ہم پر لازم اور عائد ہوتے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔

## اللہ تعالیٰ کے یہ حقوق ہم پر لازم ہیں

(ا) اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے اختیارات میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ ماننا، جو شخص کسی کو کسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات یا اس کے اختیارات میں شریک مانتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا حق مارتا ہے اور مشرک ہو جاتا ہے۔

(ب) اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر چیز سے بڑھ کر محبت رکھنا، جب نفع ونقصان، خیر وشر، کامیابی وناکامی کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور تمام کائنات کی تدبیر وانتظام وہ اکیلا فرماتا ہے اور صرف وہی مشکل کشا اور حاجت روا ہے تو لازم ہے کہ محبت حقیقی کا مرکز بھی صرف اسی کو بنایا جائے، جو شخص اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں مخلوق کے ساتھ زیادہ محبت رکھے گا تو شرک فی الحقوق کا شکار ہو گا۔

(ج) صرف اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور پرستش کرنا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات سے لازم آتا ہے کہ آدمی صرف اللہ تعالیٰ کی پرستش کرے اور اپنے انتہائی تعظیمی اعمال صرف اسی کے ساتھ خاص کرے مثلاً رکوع، سجدہ، نذر ونیاز وغیرہ جو کہ خاص تعظیمی چیزیں ہیں، اگر کوئی ان کو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے لیے بھی

روا رکھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے نام پر نذر و نیاز کو جائز مانے اور چڑھائے تو ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے حق پرستش اور تعظیم میں شرک کا مرتکب ہے۔

یاد رہے کہ جو اعمال انتہائی تعظیم و تذلل کی نشانی نہیں ہیں مثلاً التحیات کی شکل میں بیٹھنا یا کسی نیک صالح شخص کے دست کو بوسہ دینا وغیرہ وہ شرک نہیں ہے کیونکہ یہ ایسے تعظیمی اعمال نہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں، بلکہ اس طرح تعظیم و تکریم اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی بھی جائز ہے اور اللہ تعالیٰ ہی نے ہم کو ادب واحترام اور تکریم و تعظیم کا حکم فرمایا ہے، البتہ تعظیم و تکریم اور ادب واحترام کے حدود واضح ہیں، ان حدود سے تجاوز کرنا انسان کو پرستش کی حدود میں داخل کر دیتا ہے۔

(د) اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کسی کو شریک کرنا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی حق ہے کہ بندہ صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق چلنے اور زندگی گذارنے کو اختیار کرے اور صرف اسی کی بات ماننے میں دنیا وآخرت کی کامیابی کا یقین کرے، کیونکہ جب وہی نفع ونقصان کا مالک ہے تو نفع بھی صرف اسی کے حکم میں ہو گا اور ایک مؤمن کے لیے یہی لائق ہے کہ وہ زندگی گذارنے کے لیے اسی دستور زندگی کو اختیار کرے جو اللہ تعالیٰ نے خود اس کے لیے تجویز فرمایا ہے۔

پس جو شخص حلال و حرام اور زندگی کا دستور اور شریعت سازی کا اختیار اللہ تعالیٰ کے بجائے دوسروں کے لیے مانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے خلاف کسی اور کی اطاعت کو جائز قرار دیتا ہے تو ایسا شخص شرک فی الاطاعت میں مبتلا ہے۔

## اطاعتِ الٰہی میں شرک کی صورت

شرک فی الاطاعت کے بارے میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ انسانوں میں کسی انسان کی اطاعت اور پیروی صرف اس صورت میں شرک اور گمراہی ہے جب کہ

اس کے بارے میں یا کسی کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ اس کو از خود یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر سکتا ہے اس لیے اگر وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت و حکم کے خلاف کوئی حکم اور ہدایت جاری کرے تو وہ اس کو حق و درست سمجھ کر اس کی پیروی کرے جیسا کہ یہود و نصاریٰ اپنے علما اور مشائخ کے متعلق یہ گمان رکھتے تھے کہ ان کو حلال و حرام کا اختیار حاصل ہے۔

چنانچہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا
وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٣١﴾

”انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے علما و مشائخ کو رب بنا ڈالا اور مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ انہیں صرف ایک معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔“ (توبہ:۳۱)

اس آیت سے متعلق احادیث میں عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا ایک سوال منقول ہے انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہود و نصاریٰ اپنے عالموں، راہبوں اور مشائخ کو رب تو نہیں کہتے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا بات یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں ان کو وہ حرام کرتے ہیں تو تم ان کو حرام قرار دیتے ہو اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے ان کو وہ حلال کر دیتے ہیں تو تم ان کو حلال قرار دے دیتے ہو؟ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں یہ بات تو ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”فَتِلْكَ عِبَادَتُهُمْ“ یہی ان کی عبادت ہوئی۔ (دیکھیے ترمذی)

اس سے معلوم ہوا کہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کو یہ غلط فہمی تھی کہ جب تک زبان سے کسی کے خدا ہونے کا اقرار نہ کیا جائے اس وقت تک وہ خدا اور رب نہیں ہوتا اور جب تک کسی کی رسمی عبادت نہ کی جائے اس وقت تک وہ معبود نہیں بنتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کا ازالہ یوں فرمایا کہ کسی کو خداوند کہو یا نہ کہو اگر وہ حقوق و اختیارات اس کو دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں تو ایسی صورت میں تم مخلوق پرستی اور شرک کے مرتکب ہو گے خواہ تم اس مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہی کیوں نہ سمجھو۔

بہر حال قانون سازی اور اس کی تشریع اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ حق اور اختیار کسی کو نہیں دیا ہے کہ وہ حلال و حرام کا قانون بنائے اور جو شخص کسی مخلوق کے لیے یہ اختیار مانتا ہے اور اس کی بنیاد پر وہ اس کی پیروی کرتا ہے تو وہ شرک فی الاطاعت میں گرفتار ہے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، امرا اور بزرگانِ دین کی اقتدا اور پیروی کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس لیے یہ فرمانبرداری شرک اور گمراہی نہیں، بلکہ عین توحید اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے، یہی حال ائمہ متبوعین کی تقلید کا ہے وہ حلال و حرام کا قانون بناتے نہیں اور نہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے ہیں، بلکہ قرآن و سنت کے اصول سے حلال و حرام چیزوں کی فہرست تیار کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

ایسی صورت میں تو ان کی اقتدا عین اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور قرآن و سنت کی پیروی ہے۔

## اللہ تعالیٰ کے حقوق کو سمیٹا جائے تو وہ صرف عبادت اور بندگی میں آجاتے ہیں

اللہ تعالیٰ کے ان تمام حقوق (یعنی محبت، تعظیم اور توحید و پرستش) کو اگر سمیٹا جائے تو وہ صرف ایک لفظ ''عبادت'' اور بندگی میں آجاتے ہیں۔

کیونکہ عبادت کے اصل معنی عربی لغت میں انتہائی تعظیم، انتہائی عاجزی اور فروتنی کے اظہار کے ہیں اور اصطلاح میں عبادت محبت کے ساتھ اس انتہائی عاجزی، فروتنی اور خشوع خضوع کو کہا جاتا ہے جو بندہ اپنے اختیار سے اپنے خالق ومالک کے لیے ظاہر کرتا ہے۔

عبادت کے مفہوم میں انتہائی تعظیم واطاعت اور غلامی سب شامل ہیں۔ عبادت اور دل وجان سے اطاعت اس کی اختیار کی جاتی ہے جس کے متعلق یہ یقین ہو کہ وہ نفع ونقصان ، خیر وشر اور عزت وذلت کا مالک ہے، نفع اور خیر کی امید اور شر ونقصان کے خوف سے اس کو پکارا جاتا ہے، اس کی پرستش کی جاتی ہے اور اس کی دل وجان سے غلامی اور اطاعت اختیار کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کو رب اور نفع ونقصان کا مالک مانا جائے، صرف اسی کو اِلٰہ و معبود مانا جائے، اس کے سوا نہ کسی کو رب بنایا جائے نہ الٰہ اور معبود اور نہ کسی کو اس کی عبادت اور بندگی میں شریک کیا جائے۔

## شرک کی حقیقت

اس سے معلوم ہوا کہ شرک کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہم مرتبہ وہم پلہ قرار دیا جائے، بلکہ شرک کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کسی کے ساتھ وہ کام یا وہ معاملہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی بلند وبالا ذات کے ساتھ خاص قرار دیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے سامنے سجدہ ریز ہونا، کسی کے نام پر قربانی کرنا یا نذریں ماننا، مصیبت میں کسی کو پکارنا اور یہ سمجھنا کہ وہ ہر جگہ حاضر وناظر ہے اور اس کو کائنات میں متصرف سمجھنا، کسی کو

اولاد دینے والا، رزق دینے والا، بگڑی بنانے والا سمجھنا، اس طرح کی تمام چیزوں سے شرک لازم آتا ہے اور انسان اس سے مشرک ہو جاتا ہے خواہ اس کا یہ اعتقاد کیوں نہ ہو کہ انسان یا فرشتہ یا جن یا جس کے سامنے وہ سجدہ کرتا ہے یا جس کے نام پر قربانی کر رہا ہے، نذریں مان رہا ہے اور جس سے مدد مانگ رہا ہے اللہ تعالیٰ سے بہت کم اور پست مقام کا ہے اور چاہے یہ مانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے اور یہ اس کا بندہ اور مخلوق ہے لیکن وہ یہ مانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس کو کسی نفع و نقصان یا عالمِ کائنات میں کسی ایک چیز کا اختیار بخشا ہے اسی بنیاد پر وہ اس کے سامنے جھکتا ہے اور اسی کے نام قربانی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے شخص کو مشرک قرار دیا جائے گا۔

## مشرکینِ قریش کا اللہ تعالیٰ کے بارے میں عقیدہ

مشرکینِ قریش اللہ تعالیٰ ہی کو خالق و مالک اور کائنات کا مدبّر و منتظم مانتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کے اس عقیدے کی وضاحت فرمائی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَئِن سَاَلتَهُم مَّن خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الاَرضَ
وَ سَخَّرَ الشَّمسَ وَ القَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ

"اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور مسخر کیا سورج کو اور چاند کو تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے" (سورۃ العنکبوت:٦١)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَئِن سَاَلتَهُم مَّن نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحيَا
بِهِ الاَرضَ مِنۢ بَعدِ مَوتِهَا لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ

"اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا پھر اس سے زمین کو زندہ کیا اس کے مر جانے کے بعد تو وہ ضرور بول اٹھیں گے اللہ تعالیٰ نے۔" (العنکبوت:٦٣)

نیز مشرکینِ عرب کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

قُل مَن یَّرزُقُکُم مِّنَ السَّمَآءِ وَ الاَرضِ اَمَّن یَّملِكُ السَّمعَ وَ الاَبصَارَ وَ مَن یُّخرِجُ الحَیَّ مِنَ المَیِّتِ وَ یُخرِجُ المَیِّتَ مِنَ الحَیِّ وَ مَن یُّدَبِّرُ الاَمرَ ؕ فَسَیَقُولُونَ اللّٰہُ ۚ

"(اے پیغمبر آپ ان مشرکین سے) کہدیجیے کہ (بتاؤ) کون تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے یا کون ہے جو کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے اور کون ہے جو بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور کون ہے جو (اس تمام کائنات اور اس کے معاملات کا) انتظام کر رہا ہے تو وہ کہیں گے (یہ سب کچھ کرنے والا صرف ایک) اللہ۔"
(یونس:٣١)

نیز ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ۝ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝

"(اے پیغمبر) ان (مشرکینِ قریش) سے پوچھو یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے کس کا ہے اگر تم جانتے ہو؟ وہ (فوراً جواب میں) کہیں گے اللہ تعالیٰ کا ہے، کہو کیا تم (اس سے) نصیحت

حاصل نہیں کرتے۔(پھر) ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا رب (اور مالک) کون ہے؟ وہ (فوراً جواب میں) کہیں گے اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ کہو تو کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں؟ (پھر) ان سے (یہ) پوچھو کہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت (اور اختیار) ہے اور وہ پناہ دیتا (اور بچالیتا) ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا اگر تم جانتے ہو وہ کہیں گے کہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں، کہدو پھر کہاں سے تم مسحور کیے جاتے ہو؟" (مؤمنون:۸۴-۸۹)

ان آیتوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ مشرکینِ قریش آسمان وزمین کا خالق ومالک اور مدبر ومنتظم اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے اور ہر چیز پر حکومت اور اختیار وقدرت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تسلیم کرتے تھے اور وہ حقیقی مدبّر اور نفع ونقصان کا حقیقی مالک صرف اللہ تعالیٰ کو ٹھہراتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ شرک کی دلدل میں پھنس کر تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے۔

## مشرکینِ قریش کا شرک

اس سے معلوم ہوا کہ بہت سی مشرک قومیں خصوصاً مشرکینِ قریش اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق ومالک مانتے تھے، اس کی قدرتوں اور صفات پر بھی ایمان رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ کو کائنات کا مدبّر ومنتظم بھی مانتے تھے، اب سوال یہ ہے کہ پھر ان کا شرک کیا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا شرک صرف یہ تھا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق اور تقرُّب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہی نے ان دیوتاؤں کو بھی کچھ جزوی اختیارات دے رکھے ہیں اور یہ چاہیں تو بناؤ وبگاڑ کرسکتے ہیں، کوئی اولاد دے سکتا ہے اور کوئی مال ودولت کی فراوانی کا اختیار رکھتا ہے، کسی کو شفایابی کا اختیار ملا ہے، اسی بنیاد پر وہ ان کو خوش کرنے کے

لیے ان کی پرستش کرتے تھے، ان کے سامنے سجدہ ریزی اور طواف جیسے اعمال کرتے تھے، نذریں مانتے تھے اور ان سے حاجتیں مانگتے تھے ان کے اسی شرک کی وجہ سے ان کو مشرک اور دائمی عذاب کا مستحق قرار دیا گیا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ

"(اے پیغمبر ان مشرکین سے) کہہ دیجیے کہ ان کو پکارو جن کو تم نے اللہ تعالیٰ کے سوا معبود سمجھ رکھا ہے وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کوئی اختیار رکھتے ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان دونوں (یعنی آسمانوں وزمین) میں ان کی کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس (اللہ تعالیٰ) کا مددگار ہے۔" (سبا:۲۲)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی ایک ذرہ برابر ملک واختیار حاصل نہیں، نہ آسمانوں اور زمین میں کسی کی شرکت ہے اور نہ پورے عالمِ کائنات آسمانوں وزمین میں کوئی اللہ تعالیٰ کا مُعین ومددگار ہے، وہ ساری کائنات کا تنہا خالق ومالک ہے، اس کے انتظام وانصرام میں بھی اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنا معین ومددگار نہیں بنایا ہے، بلکہ اپنی خدائی کا انتظام تنہا وہ خود سنبھالے ہوئے ہے، اس نے کسی کو بھی نفع ونقصان، بناؤ بگاڑ کا ذرہ برابر اختیار نہیں دے دیا۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا

وَّ لَا نَفۡعًا ؕ وَ اللّٰہُ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۷۶﴾

"(اے پیغمبر ان سے) کہدو کیا تم اللہ تعالیٰ کے سوا اس چیز کی بندگی کرتے ہو جو تمہارے لیے کسی نفع ونقصان کی مالک نہیں اور سننے والا اور جاننے والا تو بس اللہ تعالیٰ ہی ہے۔"

(مائدہ:۷۶)

مطلب یہ ہے کہ عبادت اور بندگی تو صرف اسی ذات کی کرنی چاہیے جو حقیقی معنوں میں نفع ونقصان کا مالک ہو، ایسی ذات صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، اس کے سوا کوئی بھی نفع ونقصان کا مالک نہیں تو بندگی بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہونی چاہیے نہ کہ کسی اور کی۔

خلاصہ یہ کہ مشرکینِ عرب کا شرک یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو خالق ومالک رب مانتے تھے اور کائنات کا مدبر ومنتظم مانتے تھے اور اس کو ہر چیز کا مالک مانتے تھے اور ہر چیز پر قدرت واختیار بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہی مانتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کرکے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقربین اور برگزیدہ شخصیتوں کو اسباب سے بالاتر بھی کچھ نہ کچھ اختیارات دے رکھے ہیں اور وہ جسے چاہے اس کو وہی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں جس کا اختیار اور قدرت ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل چکی ہے تو وہ ان کو خاص خاص شعبوں میں صاحبِ اختیار ہستیاں مانتے تھے، اسی وجہ سے وہ ان کو خوش کرنے کے لیے ان کے نام کے بت بنا کر ان کی پوجا کرتے تھے اور ان کے مجسموں پر نذر ونیاز چڑھاتے تھے، وہ اپنے اس عقیدے کا اظہار ایام حج اور عمرہ کے تلبیہ میں یوں کرتے تھے:

لَبَّیۡكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیۡكَ لَبَّیۡكَ لَا شَرِیۡكَ لَكَ

إِلَّا شَرِیۡكاً هُوَ لَكَ تَمۡلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ

"حاضر ہوں میں تیری بارگاہ میں اے اللہ حاضر ہوں میں تیری بارگاہ میں تیرا کوئی شریک

نہیں مگر ایسا شریک جو تیری ملکیت و اختیار میں ہے تو ہی اس کا مالک ہے اور وہ خود کسی چیز کا مالک نہیں۔" (سیرۃ ابن ہشام، مسلم، ترمذی)

مذکورہ بالا آیتوں اور ان کے تلبیہ سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوئی کہ قریش دورِ جاہلیت میں بھی اصل و حقیقی مالک اور قادر مطلق صرف ایک اللہ رب العالمین کو مانتے تھے، جن بندوں کو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے ان کے بارے میں بھی ان کا عقیدہ یہی تھا کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے مملوک اور غلام ہیں، وہ ازخود کسی اختیار اور کسی چیز کے مالک نہیں، البتہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص خاص شعبوں میں اختیار حاصل ہے اور وہ اپنے دائرہ اختیار میں لوگوں کے لیے نفع و نقصان کے مالک ہیں اپنے خاص دائرے اور شعبے میں جیسے چاہیں نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

## اقسام شرک کا خلاصہ

شرک اصلی کے جو اقسام ہیں ان کا خلاصہ یہ ہوا:

(۱) اللہ تعالیٰ کی ذات میں شرک۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے مثل دوسرے خدا کو ماننا یا اللہ تعالیٰ کو کسی کا یا کسی کو اللہ تعالیٰ کا جز ماننا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی صفات میں جس مفہوم میں وہ اللہ تعالیٰ کے لیے مستعمل ہیں اسی مفہوم کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک ماننا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں کسی مخلوق کو شریک کرنا۔ یعنی اسباب سے بالاتر کسی کے لیے کسی طرح ملک اور اختیار کا قائل ہونا یا کسی کو نفع و نقصان یا عزت و ذلت کا مالک ماننا۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں شرک۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس کو حلال و حرام اور شریعت بنانے کا حق حاصل ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات

میں تبدیلی کا اختیار رکھتا ہے اور اسی بنیاد پر اس کی پیروی کرنا۔

(۵) کسی کو نفع و نقصان کا مالک سمجھ کر ہوش و حواس کے ساتھ دانستہ طور پر اس کے سامنے جھکنا یا سجدہ کرنا یا نذر ماننا یا اس کو پکارنا یا اس کے نام قربانی کرنا یا کسی کے نام کا وظیفہ پڑھنا مثلاً ہزار بار فلاں کا نام لینا وغیرہ۔

مذکورہ بالا اقسام شرکِ اصلی کے اقسام ہیں، ان کے علاوہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اگرچہ فی نفسہ شرک نہیں ہیں لیکن صورت شرک یا ذریعہ شرک ہیں، اگر ان کو باقی رکھا جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ اصلی شرک کا دروازہ کھول دیں گی، ایسی چیزیں بھی شریعت میں ممنوع اور حرام ہیں، ان کو شرکِ صوری یا شرکِ عملی کہا جاتا ہے مثلاً کسی کے متعلق یہ عقیدہ نہ ہو کہ وہ نفع و نقصان کا مالک ہے، لیکن اس کے سامنے صرف بطورِ ادب و سلام رکوع یا سجدے میں گر پڑنا یا کسی مخلوق کے متعلق یہ عقیدہ نہیں کہ وہ حاضر وناظر ہے اور وہ میری بات سن رہا ہے کہ میں اس کو گواہ بنا رہا ہوں، بلکہ صرف بقصدِ تعظیم اس کی قسم کھانا، اس طرح کی چیزیں چونکہ شرکِ اصلی کا سبب بن سکتی ہیں اس لیے دینِ اسلام جو آخری اور مکمّل شریعت ہے اس نے اس طرح کی تمام صورتیں بھی ختم کر دی جو ذریعہ شرک بن سکتی تھیں، اس قسم کے شرک کو شرکِ صوری یا شرکِ شبہی یا شرکِ عملی کا نام دیا جاتا ہے اور یہ تمام چیزیں شریعتِ مطہّرہ کی رو سے ناجائز اور حرام ہیں۔

## توحید

دل سے اللہ تعالیٰ کو ایک جاننے اور زبان سے اس کا اقرار کرنے کو توحید کہتے ہیں۔

شرک کی تعریف اور اس کی قدرے تفصیل سے خود بخود توحید کی حقیقت سامنے آجاتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات وصفات میں یکتا و بے مثل یقین

کیا جائے اور اس کے اختیارات اور حقوق وعبادت میں کسی کو کسی طرح شریک نہ کیا جائے اور دل وجان سے پوری طرح اللہ تعالیٰ کی بندگی کو اختیار کیا جائے۔

## توحید کی کچھ تفصیل

اس کی قدرے تفصیل یہ ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ کا وجود ہی حقیقی وجود اور ہستی ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا وہ نہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ کسی نے اس کو پیدا کیا ہے۔

(۲) کائنات اور آسمان وزمین کے ذرے ذرے کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک مانا جائے اور یہ کہ کائنات کی کوئی چیز نہ اللہ تعالیٰ کا جز ہے اور نہ بیٹا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کسی کا جز اور بیٹا ہے نہ اس کی کسی کے ساتھ کوئی رشتہ داری ہے، وہ اس طرح کے تمام تعلقات سے پاک ہے۔

(۳) وہ ہر صفت کمال سے متصف ہے اور ہر خوبی کا مالک ہے۔

(۴) وہ اپنی ذات وصفات میں یکتا وبے مثل ہے، اس کی ذات وصفات اور اس کے اختیارات میں کوئی اس کا شریک وسہیم نہیں۔

(۵) کائنات کا ہر ذرہ صرف اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور تمام کائنات آسمانوں وزمین کا تمام نظام وہ اکیلا ہی چلا رہا ہے، اس کائنات کے پیدا کرنے اور اس کے چلانے میں کوئی بھی اس کا مددگار اور شریک ومعاون نہیں۔

(۶) وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اس کی توفیق کے بغیر کوئی بھی نہ خود کچھ کر سکتا ہے اور نہ کائنات کے کسی ذرے میں ادنیٰ تصرف کر سکتا ہے۔

(۷) وہی پیدا کرنے والا، وہی پالنے والا، وہی رزق دینے والا، اولاد دینے والا، زندہ

کرنے والا، موت دینے والا، تندرست کرنے والا، بیمار کرنے والا اور امیر وغریب بنانے والا ہے۔

(۸) نفع ونقصان، عزت وذلت اور کامیابی وناکامی کا مالک صرف وہی ہے اس کے سوا کوئی نہیں تمام کائنات اور تمام مخلوق اسی کی محتاج ہے وہ کسی کا محتاج نہیں۔

(۹) صرف وہی مشکلات کو حل کرنے والا، حاجتوں کو پورا کرنے والا، خطرات اور اندیشوں سے بچانے والا ہے۔

(۱۰) صرف وہی حقیقی محبوب ومعبود بنائے جانے اور عبادت وبندگی کے لائق ہے ،اس کے سوا کوئی معبود بنائے جانے اور عبادت کے لائق نہیں۔

(۱۱) توحید کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کی خالص وصحیح بندگی سیکھنے اور معلوم کرنے کا واحد ذریعہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور اب قیامت تک کے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی اور اس کے دین کو سیکھنے کا واحد ذریعہ انبیا علیہم السلام کے سردار اور اللہ تعالیٰ کے آخری نبی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اور توحید کا یہی مفہوم سمٹ کر کلمہ توحید اور کلمہ طیبہ لا الٰہ الّا اللہ محمد رسول اللہ میں آجاتا ہے۔

## توحید کے ثمرات ونتائج

جب عقیدہ توحید کسی کا حال بن جائے تو اس کے تمام اغراض نفع ونقصان ایک ذات رب العالمین سے وابستہ ہو جائیں گے اور عملاً وہ اپنے آپ کو صرف اللہ تعالیٰ وحدہٗ لا شریک لہٗ کے سپرد کر دے گا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے سوا کسی اور کے احکام پر اپنی زندگی کا دراومدار نہیں رکھے گا،اس عقیدہ وعمل سے اس کے دل میں

اخبات خشوع، استقلال، توکل اور اخلاص کی بے انتہا قوت آجائے گی اور وہ مخلوق سے بے نیاز ہو کر ایک نڈر مجاہد بن جائے گا، وہ کسی دجال، مکار اور غیر اللہ کے سامنے جھکنے اور اس کے سامنے ذلیل ہونے سے محفوظ رہے گا، دنیاوی مصائب و تکالیف سے اس پر گھبراہٹ اور بے چینی طاری نہ ہو گی، بلکہ اس سے وہ دل میں ایک سرور محسوس کرے گا کیونکہ جس شخص کو اس پر یقین ہو کہ اس کا خالق و مالک ایک قادرِ مطلق ذات ہے اور وہ انتہائی مہربان رحم و کرم والا ہے اور جس قسم کی خیر و رحمت اس کو پہنچتی ہے محض اللہ جل شانہ کے فضل سے پہنچتی ہے کوئی دوسرا نہ اس کے عطا کرنے پر قادر ہے اور نہ روکنے کی قدرت رکھتا ہے اور اس کی قسمت کا بننا اور بگڑنا سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں اور وہی ہر قسم کے ضرر سے بچانے والا ہے، اگر اللہ نہ چاہے تو غیر اللہ چاہے جو کوئی بھی ہو اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا اور مخلوق کیسی ہی کیوں نہ ہو اسے کوئی چین و سکون نہیں دے سکتی صرف اللہ تعالیٰ کی یاد ہی اسے راحت و اطمینان دے سکتی ہے اور یہ عقیدہ اس کے دل و دماغ پر چھا کر اس کا حال بن جائے تو وہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اسی کا محتاج رہے گا، در در سے بھیک مانگنے اور مخلوق کی عملی و فکری ہر قسم کی پرستش سے بچے گا، دنیا ہی میں اسے جنت کا مزہ ملے گا اور وہ ساری دنیا سے بے نیاز اور خوف و خطر سے بالاتر زندگی گذارے گا، اس کا دل سوائے اللہ تعالیٰ کے دنیا کی کسی طاقت و قوت سے مرعوب اور مغلوب نہ ہو گا۔

## ایمان مجمل

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ

”میں ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر جیسا کہ وہ اپنے ناموں اور صفتوں کے ساتھ ہے اور میں نے اس کے تمام احکام (دل و جان سے) قبول کیے۔“

تشریح: اس کلمے کے ذریعے بندہ اقرار کرتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر اس کے تمام ناموں اور صفات کو مانتے ہوئے ایمان لایا اور میں مانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام عمدہ اور اچھے ہیں تمام اچھی اور کمال والی صفات اور خوبیاں صرف اسی کی ذاتی صفات اور ذاتی خوبیاں ہیں اور وہ صرف اسی کو زیب دیتی ہیں، وہ ہر عیب سے پاک ہے اور میں نے اس کے تمام احکام کو مان کر قبول کیا جو مجھے نبی کریم محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے پہنچے ہیں۔

## ایمان مفصّل

اٰمنتُ باللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ
وَ الْقَدرِ خَیْرِہٖ وَ شَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعالٰی وَ الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ

''میں ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر اور آخرت کے دن پر اور تقدیر پر کہ اچھی ہو یا بری سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور (میں ایمان لایا) مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھائے جانے پر۔''

اس کلمہ کے ذریعے بندہ اسلام کے ان ضروری عقائد کا اقرار کرتا ہے جن کا ذکر قرآن مجید کی بہت سی آیتوں اور نبی کریم ﷺ کی حدیثوں میں آیا ہے، اس کے بعد اب ان اسلامی عقائد کی مختصر تشریح سمجھ لیجیے:

## توحید یا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا

(۱) اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی مختصر تشریح یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق اس بات کا یقین کرے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا وجود حقیقی اور ذاتی ہستی ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ہم کو اور ساری کائنات، زمین وآسمان اور تمام موجودات کو اسی اکیلے نے بنایا ہے، وہ اکیلا سب کا مالک ہے، وہ نہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کسی نے اس کو پیدا کیا ہے۔

(۲) کائنات کی کوئی چیز نہ اللہ تعالیٰ کا جز اور بیٹا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کسی کا جز اور بیٹا ہے، نہ اس کی کسی کے ساتھ کوئی رشتہ داری ہے، وہ اس طرح کے تمام تعلقات سے منزّہ اور پاک ہے، وہ ہر کمال وخوبی سے متصف اور ہر کمال وخوبی کا مالک ہے، تمام اچھی اور کمال والی صفات اس کی ذاتی ہیں، یہ صفات ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی، اس سے کسی وقت اس کی کوئی صفت نہ دور ہو سکتی ہے اور نہ کمزور ہو سکتی ہے، وہ ہر عیب ونقص سے پاک ہے۔

(۳) وہ اپنی ذات وصفات میں یکتا اور بے مثل ہے اور اس کی ذات وصفات واختیارات میں کوئی نہ اس کا شریک ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

(۴) کائنات کا ہر ذرہ صرف اسی کے قبضۂ قدرت اور اختیار میں ہے اور کائنات آسمان وزمین وغیرہ کے تمام نظام کو صرف وہی اکیلا چلا رہا ہے، اس چلانے میں اس کے ساتھ کوئی شریک یا معاون نہیں۔

(۵) وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، اس کی توفیق کے بغیر کوئی بھی نہ خود کچھ کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی کائنات کے کسی ذرے میں ادنیٰ تصرف کر سکتا ہے۔

(۶) وہی پیدا کرنے والا، وہی پالنے والا، وہی رزق دینے والا، زندہ کرنے والا، موت دینے والا، تندرست وبیمار کرنے والا اور امیر وغریب بنانے والا ہے اور سب کچھ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

(۷) وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے، حاضر وغائب تمام علوم کے خزانوں کا مالک صرف وہی ہے، غیب کا علم اس کے بتائے بغیر کوئی نہیں جانتا، وہ غائب اور حاضر، ظاہر اور باطن ہر چیز کو جانتا ہے۔

(۸) نفع ونقصان، عزت وذلت، کامیابی وناکامی، خیر وشر ہر چیز کا مالک صرف وہی ہے، صرف وہی مشکلات کو حل کرنے والا، حاجتوں کو پورا کرنے والا، خطرات اور اندیشوں سے

بچانے والا ہے، اس کے سوا کوئی بھی نفع ونقصان، عزت وذلت وغیرہ کا مالک اور کامیابی ونجات دینے والا نہیں، تمام مخلوق اسی کی محتاج ہے وہ کسی کا محتاج نہیں۔

(۹) صرف وہی اللہ یعنی معبود بنائے جانے اور عبادت وبندگی کے لائق ہے، اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں۔

(۱۰) اسی کی عبادت اور فرمانبرداری سب پر لازم ہے اور اسی کی بندگی میں خود بندوں کی دنیاو آخرت میں کامیابی، نفع اور خیر وعزت ہے۔

## اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کا خلاصہ

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اس بات پر یقین رکھے کہ کائنات کا ہر ذرہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، کائنات کے ذرے ذرے پر صرف اسی کی حکومت ہے، تمام کائنات میں صرف اسی کا حکم اور تدبیر کارفرما ہے وہی رب العالمین ہے، عیب ونقص کی ہر بات سے پاک ہے اور ہر صفتِ کمال سے وہی متصف ہے، نفع ونقصان، عزت وذلت، خیر وشر کا مالک صرف وہی ہے اس کے سوا کوئی نہیں، اسی کی بندگی میں سراسر خیر، نفع اور حقیقی عزت ہے اور اس کے خلاف سراسر نقصان وتباہی ہے۔

## اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے اثرات ونتائج

(۱) اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کا لازمی اثر یہ ہے کہ ایسا شخص اسباب اور اپنی تدبیر وغیرہ کے بجائے اللہ تعالیٰ پر اور اس کے حکم وہدایت پر کامل بھروسہ کرتا ہے۔

(۲) ایسا شخص کامل ومکمل طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کی ہدایات واحکامات کے سپرد ہو گا، وہ صرف اسی کی بندگی کرے گا اور صرف ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی کو اپنا نصب العین بنالے گا۔

(۳) وہ ہر وقت صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا طالب رہے گا اور صرف اسی سے اور اس کے احکامات وہدایات پر چلنے میں نفع وخیر کی امید رکھے گا اور صرف اسی کی ناراضگی اور اس کے حکم کی خلاف ورزی سے ڈرے گا، وہ صرف اس سے مانگے گا اور اس سے خوف وطمع رکھے گا، اس کی امید وبیم کا مرکز اور اس کا معبود صرف ایک اللہ رب العالمین ہو کر رہ جاتا ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت رکھنے والا اور اللہ تعالیٰ کا شیدائی ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کی ہدایات واحکامات کے مقابلے میں دوسروں کے قوانین پر اعتماد کر کے مطمئن ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کے بجائے دوسروں کے قوانین کے خلاف میں نقصان وخسران سمجھتا ہے یا خوف اور امید کی حالتوں میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو ذرہ برابر نفع ونقصان کا مالک سمجھتا ہے تو ایسا شخص دعوائے ایمان کے باوجود حقیقی ایمان سے خالی اور اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹا ہے۔

## ملائکہ یعنی فرشتوں پر ایمان

(۱) بندہ اس بات پر یقین کرے کہ مخلوقات میں ایک مستقل نوع کی حیثیت سے فرشتوں کا وجود ہے۔

(۲) فرشتے اللہ تعالیٰ کی وہ نورانی، پاکیزہ اور لطیف مخلوق ہیں جن کے اندر برائی ونافرمانی کی طاقت اور صلاحیت ہی نہیں ہے، وہ ہماری نظروں سے غائب ہیں اس لیے عام طور پر نظر نہیں آتے، وہ نہ مذکر ہیں نہ مؤنث۔

(۳) ان کے پاس ذرہ برابر بھی اختیار کی قوت نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے اور نہ وہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکتے ہیں، بلکہ یہ ملکوتی قوتیں بلا چوں وچرا ان صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت چلتی ہیں اور نہایت فرمانبرداری کے ساتھ ہر آن اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں سرگرم عمل رہتی ہیں:

لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۶﴾

"وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ صرف وہی کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے۔"

(تحریم:۶)

(۴) کائنات کے نظم ونسق چلانے کے لیے فرشتوں کی مختلف جماعتیں ہیں جو مختلف خدمات پر مقرر ہیں اور ہر ایک کے لیے ایک کام مقرر ہے، وہ صرف اسی میں لگے رہتے ہیں، ان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اپنے کام میں ذرہ برابر بھی سستی کر سکے، ان میں سے بعض فرشتے انسان کے آگے پیچھے حفاظت کے لیے ہوتے ہیں جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے یہ اس کی حفاظت کرتے ہیں، ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ایسے ہوتے ہیں جو اس کے اچھے اور برے اعمال کو محفوظ اور ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح فرشتوں کی بہت سی مختلف جماعتیں ہیں اور ہر جماعت کے لیے ایک ایک کام مقرر ہے، فرشتوں کی تعداد کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ہاں اتنا معلوم ہے کہ ان میں سے چار مُقرَّب فرشتے ہیں حضرت جبرائیل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام، حضرت عزرائیل علیہ السلام اور حضرت اسرافیل علیہ السلام۔

(ا) حضرت جبرائیل علیہ السلام: یہ اللہ تعالیٰ کے احکامات پیغمبروں کے پاس لانے پر مقرر ہیں۔

(ب) حضرت میکائیل علیہ السلام: یہ مخلوق کو روزی پہنچانے اور بارش وغیرہ کے انتظام پر مقرر ہیں اور بے شمار فرشتے ان کی ماتحتی میں اللہ تعالیٰ کے احکامات بجالاتے ہیں۔

(ج) حضرت عزرائیل علیہ السلام: یہ تمام جانداروں کی روح نکالنے پر مقرر ہیں جس کی موت کا وقت آجاتا ہے وہ اس کی روح قبض کرلیتے ہیں ان کی ماتحتی میں بھی بے شمار فرشتے خدائی احکامات بجالاتے ہیں۔

(د) حضرت اسرافیل علیہ السلام: یہ قیامت کے دن صور پھونکنے پر مقرر ہیں۔

## فرشتوں پر ایمان لانے کے اثرات ونتائج

(۱) فرشتوں پر ایمان ہمیں بتاتا ہے کہ مادہ، اس کے خواص اور اس کے اندر قوتیں بذاتِ خود مؤثِّر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی ان ارواحِ مجرّدہ یعنی فرشتوں کے ذریعے ان قوتوں کو مؤثِّر بناتا ہے اور چلاتا ہے اگر یہ ارواح یعنی فرشتے نہ ہوں تو یہ تمام قوتیں بے حس وحرکت ہو کر ناکارہ ہو جائیں گی۔

(۲) فرشتوں پر ایمان رکھنے والا مادی قوتوں سے خوفزدہ نہیں ہوتا، وہ تو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کی نافرمانی سے خوفزدہ ہوتا ہے، کیونکہ مادی قوتوں کو چلانے اور مؤثر بنانے والے فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارادے کے تحت سرگرم عمل رہتے ہیں۔

(۳) جس کا اس بات پر ایمان ہو کہ فرشتے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے جھک گئے ہیں تو اس سے یہ اشارہ بھی مل گیا کہ جب یہ فرشتے انسان کے لیے جھک گئے ہیں جو کہ دنیا کے اسباب اور ان کی قوتوں پر مقرر ہیں تو جن اسباب اور قوتوں پر یہ فرشتے مقرر ہیں وہ قوتیں اور اسباب انسان ہی کے لیے مسخر ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بندہ ان اسباب اور ان کی قوتوں کو حاصل کر کے ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو فائدہ پہنچائے گا۔

ظاہر ہے کہ ایسا بندہ دنیا کے اسباب اور ان قوتوں کے سامنے نہیں جھک سکتا، اس کا سر تو صرف خالقِ اسباب رب العالمین کے سامنے جھکے گا۔

افسوس! مسلمانوں کی اکثریت کی حالت پر نظر ڈالیں تو یہی نظر آئے گا کہ وہ صرف ان اسباب اور قوتوں کے سامنے ہی نہیں جھک گئے، بلکہ وہ ان قوتوں کے سامنے بھی جھک چکے ہیں جنہوں نے ان دنیاوی اسباب اور ان سے ان کی قوتوں کو مسخر کیا ہے۔

بس فرشتوں کو ماننے والا نہ مادہ پرست اور اسباب پرست ہو سکتا ہے اور نہ وہ دنیاوی اسباب کی وجہ سے لرزاں وترساں ہوتا ہے اس کا سر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھک سکتا۔

## اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب

(۱) اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ یقین کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً جو کتابیں اپنے پیغمبروں پر نازل فرمائی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی سچی کتابیں ہیں، ان میں بندوں کے لیے زندگی گزارنے کا دستور ہے، اس لیے ان کی رہنمائی پر پورا پورا اعتماد کیا جائے اور یہ یقین کیا جائے کہ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے، ان کے علاوہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا اور کوئی راستہ نہیں، ان کے مطابق چلنے میں ہی سراسر نفع ہے اور ان کے خلاف سراسر نقصان وخسران ہے، ان کو جن لوگوں نے اپنا دستور بنایا اور ان کے مطابق چلے وہ دنیا وآخرت دونوں میں کامیاب وکامران ہوئے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں اپنے پیغمبروں پر نازل کی ہیں جن میں سے بڑی کو "کتاب" اور چھوٹی کو "صحیفہ" کہتے ہیں۔

(۳) چار مشہور آسمانی کتابوں کے نام یہ ہیں:

تورات: حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

زبور: حضرت داؤد علیہ السلام۔

انجیل: حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔

قرآن مجید: خاتم المرسلین سید الانبیا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔

(۴) آسمانی کتابوں میں سب سے آخری، سب کی خاتم، کامل و مکمل کتاب قرآن مجید ہے، یہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا، سچا ثابت کرنے والا اور ان کی محافظ بھی ہے کہ ان کتابوں میں جتنی باتیں ایسی ہیں جن کی تبلیغ ہمیشہ اور ہر زمانے میں ضروری ہوتی ہے وہ سب اس قرآن مجید میں موجود اور محفوظ ہیں اور یہ تمام آسمانی کتابوں کے ضروری مضامین پر حاوی اور سب سے مستغنی کر دینے والا ہے اور قیامت تک انسانی ضرورتوں کی کفیل ہے اور یہی وہ آخری کتاب ہے جو ہر قسم کی تحریف وتبدّل سے پاک ہے اور پاک رہے گا کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے اور فرمارہے ہیں۔

(۵) یہ قرآن مجید ایک علمی مُعجِزہ ہے، تمام دنیاوالے مل کر اس کی نظیر اور مثل نہ پیش کرسکے ہیں نہ قیامت تک پیش کرسکتے ہیں۔

(۶) قرآن مجید سے پہلے جتنی کتابیں مثلاً تورات اور انجیل وغیرہ نازل ہوئیں سب کو ہم مانتے ہیں اور یہ بھی ہم ماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اپنے وقت میں ان کو اپنا دستور بنالیا تھااور ان کے مطابق چلے تھے وہ دنیاوآخرت دونوں میں کامیاب ہوگئے تھے۔

لیکن ایک تو ان کتابوں میں لوگوں نے ردوبدل کیا تھا اور ان کے مضامین کو بگاڑ دیا تھا اور ان کے اندر ایسی تبدیلیاں کیں جنہیں ایک عام آدمی بھی سمجھ لیتا ہے کہ ان کتابوں میں تبدیل وترمیم سے کام لیا گیا ہے، نیز ان میں بعض احکامات ایسے تھے جو خاص زمانے اور خاص لوگوں کے لیے تھے اس لیے ان پہلی تمام کتابوں پر عمل منسوخ ہوچکا ہے اور اب

قرآن مجید کے سوا کسی اور آسمانی کتاب پر عمل کرنے والوں کی آخرت میں ہر گز نجات نہیں ہوگی۔

## اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کالازمی اثرونتیجہ

اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے سے انسان کی زندگی پر یہ اثرپڑے گا کہ وہ جس کتاب کو من جانب اللہ مانتا ہے اس سے شدید محبت رکھے گا اس کو چاہے گا، اس کی تعلیم وہدایت اورر ہنمائی پر پورا بھروسہ واعتماد کرے گااور اسی کو زندگی کا دستور بنائے گا۔

اسی کے مطابق چلنے میں خیر ونفع کی امید رکھے گا اور اس کے خلاف کرنے سے لرزاں وترساں رہے گا، اگر کوئی قوم یا فرد کتاب اللہ پر ایمان لانے کا مدعی ہے مگر اس کو اپنا دستور نہیں بناتا یا اس کے مطابق چلنے میں نفع وخیر کی امید نہیں رکھتا اور اس کے خلاف چلنے سے ڈرتا نہیں تو ایسا شخص اور ایسی قوم کتاب اللہ پر ایمان کے دعویٰ کے باوجود ایمان سے خالی اور اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹی اور کھوٹی ہے۔

## اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان لانا

رسالت اور نبوت کے لفظی معنی کوئی بات یا پیغام دوسروں تک پہنچانے اور خبر دینے کے ہیں اور شریعت میں رسالت ونبوت اس منصب کو کہتے ہیں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت اور اپنے احکام بندوں تک پہنچاتا اور خبر دار کرتا ہے۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اس عظیم منصب پر فائز کیا ہے شریعت میں ان کو رسول، نبی اور اردو زبان میں ان کو پیغمبر کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ:

(۱) اللہ تعالیٰ کی مرضی کی اطاعت اور بندگی انسان اپنی عقل سے پوری طرح نہیں کرسکتا اور نہ تنہا عقل کے زور سے شاہراہِ زندگی پر چلنے کی مکمل رہنمائی حاصل کرسکتا ہے،

یہ رہنمائی وحی الٰہی رسالت و نبوت کے ذریعے ملتی ہے اور وحی ورسالت ہر انسان کو نہیں ملتی، بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنے علم کے مطابق نبی اور رسول بنا کر بھیجتا ہے۔

(۲) اور وحی اور رسالت کا یہ سلسلہ نبی کریم محمد ﷺ پر کامل و مکمل ہو کر ختم ہو گیا ہے۔

(۳) کسی کو نبی ورسول ماننے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ یہ یقین کرے کہ غیبی حقیقتوں کے بارے میں وہ جو کچھ بتاتا ہے اور ہم کو جو ہدایات دیتا ہے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، ان کی یہ ساری باتیں گویا اللہ تعالیٰ کی باتیں ہیں اور ان کا ہر حکم اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لیے سب حق ہی حق ہیں، اس میں کسی قسم کے چوں چرا اور شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۴) نیز یہ یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں پر جو ہدایات اور احکامات نازل کیے ہیں، انہوں نے وہ سب بندوں تک پہنچا دیے ہیں، ان میں انہوں نے اپنی طرف سے نہ کوئی کمی بیشی کی ہے اور نہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے کسی پیغام کو چھپایا ہے۔

(۵) جب یہ بات معلوم ہوئی کہ کسی کو نبی ورسول ماننے کے بعد یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کی ہر اس بات پر ایمان لایا جائے جو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتلائے اور اس کی کسی ایک بات کا انکار بھی اس کی نبوت کا انکار اور کفر ہے تو ہر اس حقیقت اور حکم پر یقین کرنا اور اس پر عمل کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے جس کی اطلاع سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔

خلاصہ یہ کہ پیغمبر کے ہر حکم اور ہر فیصلے کا ماننا شرطِ ایمان ہے، جو شخص پیغمبر کے ایک حکم کے ماننے سے بھی انکار کرے وہ مؤمن نہیں ہو سکتا، البتہ جن مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کا مبارک زمانہ نہ پایا ہو اور آپ ﷺ کی تعلیمات وہدایات ان کو دوسروں

کے واسطے سے پہنچی ہوں جیسا کہ ہمارا حال ہے ان کے لیے یہ حیثیت صرف ان ہی عقائد اور احکامات کی ہے جو رسول اللہ ﷺ سے ایسے قطعی اور یقینی طریقہ سے ثابت ہیں جس میں کسی شک وشبہ اور کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں اور ہر دور میں ان کی شہرت بھی اتنی عام رہی ہے کہ دین سے معمولی واقفیت رکھنے والی عوام بھی ان سے واقف رہی ہو جیسا کہ ضروری عقائد نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی فرضیت وغیرہ اور جن چیزوں کا یقینی ہونا اور ان کی شہرت اس درجہ کی نہیں (اگرچہ ان کا ثبوت ہمارے لیے قابلِ اطمینان ہو پھر بھی) ان کا انکار اگرچہ ایک درجہ کی گمراہی ہے لیکن کفر نہیں۔

(۶) اللہ تعالیٰ کے تمام رسول اور تمام انبیا علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بندے، انسان اور بشر ہوتے ہیں لیکن وہ انسانیت کے حقیقی اور بلند ترین نمونے ہوتے ہیں، وہ احکام، اخلاق اور فضائلِ اعمال کے مظہر اور زندہ شخصیات ہوتے ہیں، وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے اور نہ جھوٹ موٹ کا لباس اور شکل وصورت اختیار کرتے ہیں، وہ تکلُّف و تصنُّع اور بناوٹ سے پاک ہوتے ہیں۔

(۷) وہ معصوم اور پاک ہوتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اول سے آخر تک اس قدر سلیم الفطرت اور سلیم القلب ہوتے ہیں کہ ان سے ارادے کے ساتھ گناہ اور خطا کا صدور ناممکن ہوتا ہے۔

(۸) کوئی بھی شخص اپنی کوشش، عبادت اور ریاضت سے نبی ورسول نہیں بن سکتا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے بندوں میں سے جن کو چاہا ان کو رسالت ونبوّت کے اس عظیم منصب کے لیے منتخب فرمایا۔

(۹) منصبِ نبوّت کے اعتبار سے تمام انبیا علیہم السلام برابر ہیں، لیکن فضیلت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فوقیت عطا فرمائی ہے اور تمام پیغمبروں میں سب سے زیادہ فضیلت

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمائی ہے۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بہت سے پیغمبر بھیجے ہیں، ان کی ٹھیک تعداد اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں البتہ ان میں سے بعض کے نام بتائے ہیں، بہت سے انبیا علیہم السلام کے نام وحالات سے ہم ناواقف ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں، ان سب کو برحق مانتے ہیں ان میں سب سے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخر خاتم الانبیا والمرسلین حضرت محمد رسول ﷺ ہیں۔

ان پر نبوت اور رسالت کا یہ سلسلہ کامل ومکمل ہو کر ختم ہوا، آپ ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا اور نہ کسی نبی کی ضرورت رہی، بلکہ آپ ﷺ کی نبوت ورسالت دنیا کے تمام انسانوں اور جنات کے لیے قیامت تک رہے گی۔ البتہ نبی کریم ﷺ کے بعد دینِ اسلام کو انفرادی اور اجتماعی طور پر لوگوں میں نبی کریم ﷺ کے طریقے پر قائم کرنا اور رکھنا امتِ مسلمہ کا بنیادی فریضہ ہے اور اب قیامت تک کے لوگوں کی نجات وفلاح صرف خاتم الانبیا سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی تعلیمات وہدایات کی اتباع اور پیروی میں ہے اور آپ ﷺ کے بعد جو شخص بھی نبوت اور پیغمبری کا دعویٰ کرے وہ کذّاب اور جھوٹا ہے۔

## انبیا علیہم السلام پر ایمان لانے کے زندگی پر اثرات

انبیا علیہم السلام اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی وجہ سے انسان کی زندگی میں لازماً تبدیلی آئے گی، اس کی پوری زندگی نبی کریم ﷺ کی سنت اور طریقے کے مطابق ہوگی اسی میں خیر اور نفع دیکھے گا اور پائے گا، جو شخص نبی کریم ﷺ کی ان باتوں کی اتباع اور پیروی نہیں کرے گا جو آپ ﷺ سے یقینی یا قابلِ اطمینان طور پر ثابت ہیں تو یہ اس

کا حقیقی ایمان نہیں، بلکہ ایمان کا زعم اور خیال ہے، ایسا شخص صرف خوش فہمی میں مبتلا ہے حالانکہ نجات کا دارومدار خوش فہمیوں پر نہیں، بلکہ حقیقی ایمان پر ہے۔

## آخرت پر ایمان لانے کا مختصر مطلب

آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ یہ یقین کرے کہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری زندگی اور ایک دوسرا عالم آنے والا ہے، وہاں انسان کو اس کے اچھے اور برے ارادوں اور اعمال کی جزا اور سزا ملے گی اور اس میں انسان اپنے ہر ارادے اور قول و فعل کا جواب دہ ہوگا۔

## آخرت پر ایمان لانے کی ضروری تفصیل

آخرت پر ایمان لانے کی ضروری تفصیل یہ ہے:

(۱) ہماری ایک زندگی تو وہ ہے جو اس وقت ہم گزار رہے ہیں، اس وقت رہ رہے ہیں، اس کو ہم اس لیے دنیا کی زندگی کہتے ہیں کہ وہ ہمیں اس وقت حاصل اور ہمارے قریب ہے۔

(۲) دوسری زندگی ہماری اس زندگی کے بعد شروع ہوگی کیونکہ انسان ختم نہیں ہوتا، بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

اس دوسری زندگی کے تین مرحلے ہیں، قبر اور برزخ، قیامت، اور بعد کی زندگی، لہٰذا جو شخص مر جاتا ہے تو موت اس کو قبر اور برزخ کی زندگی میں منتقل کر دیتی ہے جس میں انسان اپنے اعمال کے مطابق جنت کی ہواؤں کی خوشبو اور خوشیوں یا جہنم کی تپش اور بدبو کو چکھے گا، دوسری زندگی کا یہ مرحلہ قیامت تک رہے گا۔

(۳) جس طرح انسان دنیا میں ہمیشہ نہیں رہ سکتا اسی طرح دنیا کا یہ نظام بھی ہمیشہ کے لیے نہیں، بلکہ اس نظام کے لیے موت مقرر ہے۔

بلاشبہ ایک ایسا دن آنے والا ہے جس میں اس دنیا پر اجتماعی موت طاری ہو جائے گی، نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا، دنیا کا چاند اور سورج وغیرہ سب ختم ہو کر ایک نیا عالَم برپا ہو گا۔

اس طرح دنیا کی یہ اجتماعی موت انسانوں کو دوسری زندگی کے دوسرے مرحلہ حشر ونشر میں منتقل کر دے گی۔

(۴) سوال وجواب اور حساب وکتاب کے بعد جو لوگ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق جنتی قرار پائیں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جو جہنمی اور دوزخی قرار پائیں گے وہ جہنم میں جائیں گے، مختصر یہ کہ قبر اور برزخ آخرت کی زندگی کا پہلا مرحلہ اور پہلی منزل ہے، حشر ونشر دوسرا مرحلہ اور دوسری منزل ہے، پھر حساب وکتاب کے بعد آخری ٹھکانا جنت یا جہنم کی صورت میں ہو گا۔

(۵) جنت اس قدر راحت واطمینان اور خوشیوں کی جگہ ہے کہ ان خوشیوں کا ہم اس دنیا میں تصوّر بھی نہیں کر سکتے، پھر جنت (جس میں نہ موت ہو گی نہ خوف وغم) میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برابر خوشیوں اور نعمتوں میں اضافہ ہوتا رہے گا اور یہ سلسلہ ابد الآباد جاری رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جنت الفردوس نصیب فرمائے۔

(۶) اور جہنم اس قدر وحشت ناک اور دردناک عذاب کی جگہ ہے جس کے درد وغم کا اس دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور جہنم کا یہ سلسلہ بھی برابر ترقی کر کے ہمیشہ کے لیے رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جہنم کی معمولی تپش اور بدبو سے بھی بچائے۔ آمین

## آخرت کے عقیدے کا خلاصہ

آخرت سے مراد وہ عرصہ اور دوسری زندگی کے وہ مراحل ومنازل ہیں جو مرنے

کے بعد سے قیامت قائم ہونے تک اور پھر حشر و نشر، حساب و کتاب اور جنت یا دوزخ سب پر مشتمل ہیں، یہ دوسری زندگی یعنی قبر اور برزخ کے احوال، حشر و نشر، حساب و کتاب، اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہونا، جزاوسزا اور جنت و دوزخ یہ سب اٹل حقائق ہیں جن کا وقوع پذیر ہونا اور پیش آنا ایسا یقینی اور لازمی ہے جس میں ذرہ برابر کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

## کامیاب ہونے کا اصل معیار

اس سے معلوم ہوا کہ کامیابی وناکامی کا اصل معیار دنیا کی خوشحالی یا بدحالی نہیں، بلکہ درحقیقت فلاح ونجات پانے والا کامیاب انسان وہ ہے جو دوسری زندگی میں اللہ تعالیٰ کے آخری فیصلے کی رو سے کامیاب ٹھہرے اور ناکام وہی ہے جو بعد میں آنے والی زندگی اور آخری فیصلے کی رو سے ناکام رہے۔

## آخرت پر ایمان لانے کے اثرات

آخرت پر ایمان رکھنے والے کی زندگی پر جو لازمی اثرات پڑسکتے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) آخرت کو ماننے والا شخص بڑا ذمہ دار ہوتا ہے۔

(۲) وہ غریبوں، مسکینوں اور بے کسوں کا خیال رکھے گا اور ہر ذی حق کو اپنا حق پورا پورا ادا کرے گا۔

(۳) وہ زندگی کے کسی لمحے کو ضائع کرنے سے پریشان اور شرمندہ ہوگا اور اپنے لمحات کو آخرت کے لحاظ سے قیمتی بنانے کی کوشش کرتا ہے، جو کام اس کی آخرت اور دوسری زندگی کے لیے مفید ہو اگرچہ اس کام کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں اسے سخت دکھ درد یا سخت مشقت یا سخت نقصان اٹھانا پڑے بہر حال وہ اس کام اور بات کو کر گزرے گا اور

ہر اس کام سے پرہیز کرے گا جس سے اس کی آخرت کی زندگی پر زد پڑتی ہے اگرچہ دنیا کی زندگی میں اس بات کی وجہ سے اس کو بڑی راحت، عزت اور بہت مال ودولت حاصل ہونے کا یقین ہو۔

(۴) آخرت پر ایمان رکھنے والا ریاکار نہیں ہوتا وہ ہر اچھا اور نیک کام اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کرتا ہے اور اس پر کسی دنیاوی غرض کے بجائے آخرت میں جزاوثواب کا امیدوار ہوتا ہے۔

## تقدیر پر ایمان لانے کا مختصر مطلب

قدر اندازہ اور پیمانہ کو کہتے ہیں۔ اس عقیدے کا مختصر مطلب یہ ہے کہ بندہ اس بات کا یقین کرلے کہ کائنات کی ہر چیز اور ہر نیکی وبدی، کے لیے اللہ تعالیٰ کے علم میں ایک اندازہ مقرر ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو پیدا کرنے سے پہلے ہی اس کی تمام حالتوں کو جانتا ہے، اللہ تعالیٰ کے علم اور اندازے سے کائنات کی کوئی چیز باہر نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے اس علم واندازے کو تقدیر کہتے ہیں۔

## تقدیر کے متعلق ضروری تفصیل

(۱) اللہ تعالیٰ تمام چیزوں اور تمام حالات وواقعات کو ان کے وجود میں آنے سے پہلے ہمیشہ ہی سے جانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر چیز کے اسباب، اس کی بقاوفنا اور اس پر تمام آنے والے حالات کا ایک اندازہ ان کے وجود میں آنے سے پہلے ہمیشہ سے مقرر ہے، خیر وشر، نفع ونقصان، کامیابی وناکامی، موت وزندگی کے اندازے اور حدود وقوانین بھی اندازہ کیے ہیں اور خیر وشر وغیرہ کی حدود بھی مقرر فرمائی ہیں اور یہ اندازہ بھی مقرر ہے کہ ان کے وجود اور ظہور میں آنے کے اسباب کیا ہوں گے؟ ان اسباب کی حدود اور پیمانے مقرر ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ازل سے ہی سے ابد الآباد تک رونما

ہونے والے تمام امور اور حالات و واقعات کا اندازہ مقرر ہے اور پوری کائنات کی چیزیں اور حالات و واقعات اللہ تعالیٰ کے اسی علمِ سابق اور اس ازلی اندازے اور منصوبے کے مطابق موجود ہیں جو پیش آتے رہتے ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا یہ علم و اندازہ اور تقدیر تمام کائنات اور ابد الآباد تک کی تمام چیزوں کے بارے میں زمین و آسمان، ستارے اور سیارے، سورج، چاند، ہوائیں، پانی، جڑی بوٹیاں، حیوانات، انسانوں، انسانوں کے اعمال و نتائج اور حالات اور پھر جنت دوزخ اور ان میں تمام چیزوں اور ان میں تمام آنے والے حالات اور تغیرات ہر چیز کے لیے اللہ تعالیٰ کے علم میں ایک اندازہ اور پیمانہ مقرر ہے۔

(۳) اور یہ تقدیر اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم و حکمت اور لامحدود قدرت وغیرہ جیسی صفات کا لازمی تقاضا اور خاکہ ہے اور تقدیر کا انکار دراصل اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت اور قدرت کا انکار ہے۔

## تقدیرِ انسانی

یہاں تقدیر انسانی کے بارے میں ضروری تفصیل جان لیجیے۔

انسان کی تقدیر کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک اس کے وجود، اس کی بقا، فنا وغیرہ حالات سے تعلق رکھتی ہے، اس تقدیر میں انسان کی فکر و عمل کا کوئی دخل نہیں ہوتا مثلاً انسان کی پیدائش اور اس کے جسم کی شکل و صورت، جوانی بڑھاپا، مرنا اور جینا وغیرہ جیسی چیزیں جن میں انسان کے عمل و فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ تکوینی طور پر یہ چیزیں اور یہ احوال وغیرہ غیر اختیاری طور پر خود بخود انسان پر آتے رہتے ہیں۔

(۲) دوسری قسم کی تقدیر خود اس کے دائرہ عمل کے لحاظ سے ہے، یہ وہ چیزیں ہیں جن میں انسان کے عمل و فکر کا دخل ہوتا ہے مثلاً سچ کہنا، جھوٹ کہنا، شادی کرنا، نہ کرنا، علم حاصل کرنا، ملازمت اختیار کرنا، زراعت تجارت یا باغبانی کرنا، حق کا طالب بننا، ایمان واسلام نیکی کی راہ یا بدی کی راہ اختیار کرنا وغیرہ جیسے تمام اعمال اور باتیں انسان کے دائرۂ اختیار اور عمل میں داخل ہیں، ان میں وہ آزاد ہے جس کام، جس بات، جس نظر اور جس عمل کو اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے۔

(۳) اس دوسری قسم میں انسان کو کسب و عمل کرنے اور کسی بات و نظریہ کے اپنانے کی کھلی آزادی اور اختیار حاصل ہے مگر اس کے نتائج اور اس سے پیدا ہونے والے واقعات انسان کے قبضہ قدرت سے باہر ہیں مثلاً انسان کو یہ آزادی تو ہے کہ گندم کاشت کرے اور اس کی حتی الوسع خدمت اور حفاظت کرے مگر خدمت اور کاشت کا نتیجہ یعنی گندم کا پیدا ہونا اور آفات سے بچنا وغیرہ یہ انسان کی قدرت و اختیار سے باہر ہیں، انسان شادی کرتا ہے علاج کرتا ہے لیکن اس کا نتیجہ اولاد اور شفاء اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے یہی حال تمام کاموں، اعمال اور تدبیروں کا ہے کہ ان پر نتائج مرتّب کرنا اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے، وہی اپنے مقررہ اندازوں اور قوانین کے مطابق نتائج کو ظہور اور وجود میں لاتا ہے۔

(۴) اس دوسری قسم کی انسانی تقدیر کے بارے میں اس حقیقت کو سامنے رکھیں کہ اس دنیا میں جس طرح ہم اپنے ارادے و اختیار سے تمام کام کرتے ہیں نیکی، بدی، خیر و شر، شفاء و بیماری وغیرہ کے اسباب کو اختیار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ازل میں اس طرح ان کا علم اور اندازہ تھا اور یہ بھی اس کے علم اور اندازے میں مقرر تھا کہ ان اسباب اور تدابیر سے کیا کیا نتائج بر آمد ہوں گے اور ان اعمال پر کیسی جزا و سزا، نعمتیں اور عذاب و سزائیں ملیں گی،

غرض یہ کہ اس دنیا میں جن مقاصد کے لیے ہم جو کوششیں اور تدبیریں کرتے ہیں اور جس کوشش اور تدبیر سے وہ چیز دنیا میں حاصل ہونے والی ہوتی ہے وہ سب کی سب تقدیر کے ساتھ بندھی ہوئی ہوتی ہیں۔

## انسانی افعال و نتائج کے بارے میں تقدیر کا خلاصہ

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ارادوں، کسب و اعمال، ان کی کمائی اور ان کے قصد اً گناہوں میں مبتلا ہونے یا نیکیوں کو اختیار کرنے کا ازل سے علم رکھتا ہے اور اول سے یہ جانتا ہے کہ لوگ اپنے ارادے اور اختیار سے یہ سب کچھ کریں گے اور ان کے اختیاری اعمال پر فلاں قسم کے نتائج اور اثرات مرتّب ہوں گے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے جان لینے اور اندازہ کر لینے کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو نیکی یا بدی کے کاموں کے لیے مجبور کر دیتا ہے، بلکہ وہ اپنے عمل و کسب اور نیکی و بدی کے کام کرنے کے لیے آزاد ہیں، یہ ان کی اپنی کمائی ہے جس کا اچھا یا برا بدلہ انہیں ملے گا۔

## عقیدۂ تقدیر میں اِفراط و تفریط

عقیدۂ تقدیر کے بارے میں لوگ بڑے اِفراط و تفریط میں مبتلا ہیں، کچھ بے دین لوگ تو وہ ہیں جو تقدیر کے قائل ہی نہیں، انہوں نے تو اسباب اور تدبیر ہی کو اپنا الٰہ و معبود بنا رکھا ہے اور بعض ناواقف ایسے بھی ہیں جنہوں نے تقدیر کو اپنی کم ہمتی، بے عملی اور بے کاری کا بہانا بنا لیا ہے حالانکہ عقل، تدبیر اور اسباب بھی تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں، ان سے فائدہ نہ اٹھانا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری اور بے وقوفی ہے، البتہ عقل اور اسباب کو اسباب کے درجے سے بڑھانا درست نہیں، بلکہ تدبیر و اسباب کو اختیار کر کے یہ

یقین رکھیں کہ نتائج اور ثمرات کا پیدا کرنے والا اور مرتّب کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کے سوا کوئی نتائج اور ثمرات کو پیدا نہیں کر سکتا۔

## تقدیر کو نافرمانی اور معصیت کا عذر بنالینا مشرکین کا شیوہ ہے

تقدیر کو نافرمانی، معصیت اور کم ہمتی کے لیے عذر بنانا مسلمانوں کا نہیں، بلکہ مشرکین کا شیوہ ہے کیونکہ مسلمان اس حقیقت کو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل، سمجھ بوجھ اور دیگر اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا ہے، اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کی قوت وصلاحیت رکھی ہے، اس کے سامنے نیکی اور بدی دونوں کے راستے واضح کر دیے ہیں اور ان پر چلنے کا اختیار دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ نیکی کا راستہ اختیار کروگے تو یہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہو گا اور اس پر ثواب وانعام سے نوازے جاؤ گے اور اگر بدی کے راستے کو اختیار کروگے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے غضب کا باعث ہو گا جس کی وجہ سے سزا اور عذاب کے مستحق قرار پاؤ گے۔

لہٰذا مسلمانوں کو جن چیزوں سے راحت وسکون ملتا ہے یا اچھی معلوم ہوتی ہیں یا وہ کوئی نیکی اور بھلائی کا کام کرتا ہے تو وہ اسے اللہ تعالیٰ کا احسان اور توفیق سمجھتا ہے اور اگر اسے اپنی بے تدبّری یا اپنی غلطی پر کوئی ناکامی، مصیبت یا تکلیف پیش آجاتی ہے یا نفس وشیطان کے ورغلانے سے کوئی بری بات یا برا کام کرتا ہے تو وہ اسے اپنی غلطی سمجھتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَآ اَصَابَكَ مِن حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَ مَآ اَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفسِكَ

”تمہیں جو بھلائی (یعنی سکھ وآرام اور خیر وخوبی) پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچتی ہے اور جو برائی (اور دکھ وتکلیف) پہنچتی ہے تو وہ تمہارے اپنے نفس کی طرف سے پہنچتی ہے۔“

(النساء:۷۹)

اس کا حاصل یہی ہے کہ جن چیزوں سے انسان کو راحت وسکون ملتا ہے یا اس کو اچھی معلوم ہوتی ہے، وہ کوئی نیکی کر دیتا ہے تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے احسان اور اس کی توفیق سے ہوتا ہے اور جن چیزوں سے انسان کو اذیت اور تکلیف ہوتی ہے یا وہ اسے بری معلوم ہوتی ہیں یا وہ کوئی برائی کر دیتا ہے تو ان تکالیف، اذیتوں اور برائی کے نتائج و ثمرات کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن ان کے کسب کرنے والا خود انسان ہی ہے اور وہی اس کا ذمہ دار ہے۔

اور اس کے برعکس جو لوگ تقدیر کو اپنی بے گناہی کا بہانہ بنالیتے ہیں ان کی حالت ان مشرکین جیسی ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَ قَالَ الَّذِينَ اَشرَكُوا لَو شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدنَا مِن دُونِهٖ مِن
شَیءٍ نَّحنُ وَ لَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمنَا مِن دُونِهٖ مِن شَیءٍ

”اور جن لوگوں نے شرک کیا وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کو نہ پوجتے نہ ہم نہ ہمارے آباواجداد اور نہ ہم اس کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔“
(نحل:۳۵)

یہ مشرکین کی کج بحثی کی مثال ہے کہ رسولوں کو چپ کرانے کے لیے کہتے تھے کہ ہم جن معبودوں کو پوجتے ہیں اور ان کے نام پر جن چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی مرضی کے عین مطابق ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، اگر ہمارے یہ کام اس کی مرضی کے خلاف ہوتے تو وہ ہمیں اپنی قدرت سے ان کاموں سے روک دیتا اور ہم ان میں سے ایک کام بھی نہ کر پاتے۔

یہ ان کی ایسی احمقانہ باتیں تھیں کہ جن کے جواب کی بھی ضرورت نہیں ہے، ان کو بیان ہی صرف اس لیے کیا تا کہ ان کی حماقت سامنے آئے۔

## انسان کی زندگی پر عقیدۂ تقدیر کے اثرات و نتائج

انسان کا یہ حال کہ وہ اپنی تدبیر اور کوشش و عمل کی ذرا سی کامیابی پر فخر و غرور کرتا ہے اور جہاں ذرا سی ناکامی سامنے آجاتی ہے تو دل شکستہ ہو کر ہمت ہار جاتا ہے، یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں ہیں اور یہ انسان کو اس لیے لگ جاتی ہیں کہ وہ اپنے اچھے عمل یا برے نتائج کو خود اپنی تدبیر اور کوشش کا لازمی نتیجہ سمجھتا ہے اس لیے وہ مغرور بھی ہوتا ہے اور مایوس بھی۔ یہ دونوں بیماریاں انسان کے حق پر صبر و استقامت، متانت اور استقلال کو برباد کر دیتی ہیں۔

لیکن جس شخص کا عقیدۂ تقدیر پر سچائی سے ایمان ہو تو اس پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، لہٰذا اگر اس کو کوئی خیر و بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر اس کی گردن اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جاتی ہے اور اس نعمت پر اترانے اور فخر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں یہ نعمت مجھ سے چھن نہ جائے اور جب کسی ناکامی کا سامنا ہوتا ہے تو وہ اپنے ارادوں اور عملی زندگی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے کہ اس میں کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور حکم کے خلاف تو نہیں، اس طرح وہ اپنی اصلاحِ نیت اور اصلاحِ عمل کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے آئندہ کامیابی کی امید رکھتا ہے اور اگر اس کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا یہ بندہ اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام عبث اور خلافِ حکمت نہیں ہوتا اور نہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ اپنے بندوں کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہے، وہ تو اپنے بندوں پر ستر ماؤں سے بھی زیادہ مہربان اور شفیق ہے تو اس مصیبت اور تکلیف میں اللہ تعالیٰ اس کے لیے خیر و رحمت کا سامان پیدا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُل لَّن يُّصِيبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَولٰنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ

''آپ کہہ دیجیے ہمیں ہر گز نہ پہنچے گا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے، وہ ہمارا مولا (خیر خواہ اور کارساز) ہے اور اللہ تعالیٰ ہی پر چاہیے کہ مؤمن بھروسہ رکھیں۔''

(سورۂ توبہ:۵۱)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَعَسٰٓى اَن تَكرَهُوا شَيئًا وَّ يَجعَلَ اللّٰهُ فِيهِ خَيرًا كَثِيرًا ﴿۱۹﴾

''پس ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں (تمہارے لیے) خیر کثیر رکھ دی ہو۔'' (سورۂ النساء:۱۹)

غرض یہ کہ جن لوگوں کا تقدیر پر ایمان ہوتا ہے ان کی گردنیں عین کامیابی وکامرانی اور مالی جانی خوشحالیوں میں اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جاتی ہیں اور ناکامی کی حالت میں (خواہ مالی تنگی، سیاسی مصیبت، عزیزوں کی موت، لڑائیوں کی ناکامیوں غرض کسی حالت میں بھی) رحمتِ الٰہی سے مایوس نہیں ہوتے، بلکہ وہ ہمیشہ اپنی فکر و عمل کی اصلاح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَآ اَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِى الاَرضِ وَ لَا فِىٓ اَنفُسِكُم اِلَّا فِى كِتٰبٍ مِّن قَبلِ اَن نَّبرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ ﴿۲۲﴾ لِّكَيلَا تَاسَوا عَلٰى مَا فَاتَكُم وَ لَا تَفرَحُوا بِمَآ اٰتٰكُم ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُختَالٍ فَخُورٍ ﴿۲۳﴾

"کوئی مصیبت نہ زمین میں آتی ہے اور نہ تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے اس سے پہلے کہ ہم ان کو پیدا کریں بے شک یہ (لکھنا اور ہر چیز کا اندازہ کرنا) اللہ تعالیٰ کے لیے (کوئی مشکل نہیں بلکہ) آسان ہے (اور اس موقع پر تمہیں ایسی حقیقت کی یاد دہانی اس لیے کرائی جاتی ہے) تاکہ تم غم نہ کرو (اور مایوس ہو کر ہمت نہ ہارو) اس پر جو تم سے فوت ہو اور نہ اس چیز پر فخر کرو جو اس نے تم کو دیا اور اللہ تعالیٰ اترانے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔" (حدید:۲۲-۲۳)

## تقدیر کے اثرات کا خلاصہ

مذکورہ بالا مختصر بیان سے معلوم ہوا کہ انسانی زندگی پر تقدیر کے جو اثرات پڑتے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) تقدیر پر ایمان رکھنے والا ناکامیوں اور تنگیوں وغیرہ میں مایوسی کا شکار نہیں ہوتا اور نہ وہ بے ہمت ہوتا ہے، بلکہ اپنے ارادے اور عمل کی اصلاح کرتا رہتا ہے اور پوری ہمت سے کام لے کر اللہ تعالیٰ سے خیر و کامیابی کا امیدوار ہوتا ہے۔

(۲) وہ دولت و ثروت، مال و اولاد کی کثرت، منصب اور فتوحات پر اترانے والا، فخر کرنے والا، احسان جتانے والا اور بخل کرنے والا نہیں ہوتا۔

(۳) اس کا اعتماد اپنی تدبیر اور اسباب پر نہیں ہوتا، بلکہ اس کا بھروسہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کی ہدایات واحکامات کی تعمیل پر ہوتا ہے۔

(۴) عین مصیبت کے وقت بھی وہ اللہ تعالیٰ سے خیر کثیر کا امیدوار ہوتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اسی مصیبت اور تکلیف کے اندر سے بہت زیادہ خیر و نفع کی صورتیں نکال دے۔

(۵) ایسا شخص قانع اور اپنی حالتِ روزی پر مطمئن رہتا ہے، وہ کسی کی عزت اور کسی کے مال و ثروت وغیرہ جیسی خوشحالیوں سے نہیں جلتا، بلکہ وہ ہمیشہ تقدیر پر راضی رہتا ہے

جیسا کہ ہسپتال میں پڑے ہوئے مریض اپنی اپنی دوائیوں اور اپنے پرہیز پر قانع رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے نہیں جلتے اور سب کے سب شفیق ڈاکٹر کے ساتھ محبت رکھتے ہیں اگرچہ وہ ان کو کڑوی دوا پلاتا ہے، آپریشن کرتا ہے اور سخت پرہیز بتاتا ہے۔

(۶) تقدیر پر ایمان رکھنے والا مال و منصب کے حصول کے لیے جائز اسباب کو اختیار کرلیتا ہے کیونکہ اس کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ عزت وذلت اور خوشحالی و بدحالی سب مقدّر ہیں، پھر ان چیزوں کے لیے ناجائز اسباب اختیار کرنے کی کیا ضرورت؟

(۷) وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں خطرناک سے خطرناک کام کے لیے قدم اٹھاتا ہے اور پوری بہادری وشجاعت سے باطل کا مقابلہ کرتا ہے، کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ موت کا اپنے وقت پر آنا یقینی ہے اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا لہٰذا مجھے وہی کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، غرض یہ کہ جو کام کرنے کے ہیں یعنی حق ہیں اس کے دل میں اس حق پر جمے رہنے کا وہ عزم ہوتا ہے جس کو نہ پہاڑ روک سکتے ہیں، نہ سمندر بہالے جاسکتا ہے، نہ حوادث و مصائب کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا ہے اور نہ ہی بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اس کو جلاسکتے ہیں۔

## تقدیر کے بارے میں آخری گزارش

تقدیر کا تعلق عالَمِ غیب سے ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت، قدرت اور اس کی صفات سے تعلق رکھتی ہے اس لیے بہت نازک اور مشکل مسئلہ ہے۔

اس کی اصل حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ انسان کا علم وعقل محدود اور اللہ تعالیٰ کی ہر صفت غیر محدود ہے تو غیر محدود کو محدود عقل سے تولنے کی مثال ایسی ہے جیسا کہ سُنار کے ترازو میں پہاڑوں کو تولنا۔

تقدیر کے جس قدر ضروری گوشے ہیں جن کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے اور جن سے انسان کی زندگی سنور سکتی ہے ان ضروری گوشوں کو قرآن وحدیث نے کھول کر بیان کیا ہے اور ان کا ضروری بیان یہاں بھی آچکا ہے، اس سے آگے اس مسئلہ میں زیادہ کاوش نہ کریں، یہ کاوش بے سود بھی ہے اور نقصان دہ بھی، اس لیے نبی کریم ﷺ نے ایسی فضول کاوشوں سے سختی سے منع فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو تقدیر پر سچائی کے ساتھ ایمان نصیب کرے اور اس کے نیک نتائج و ثمرات سے بھرپور حصہ اٹھالینے کی توفیق عنایت فرمائے۔ (آمین)

## عقیدۂ ختمِ نبوت

(۱) ہمارا ایمان ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، آپ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ کامل اور مکمل ہو کر ختم ہوا۔

(۲) جو شخص نبی کریم ﷺ کے بعد کسی طرح نبوت کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا اور دجال ہے وہ اور اس کا ماننے والا کافر ہے۔

(۳) جو شخص ایسے جھوٹے سے یا اس جھوٹے کے پیروکاروں سے اس کے دعویٰ نبوت پر دلیل اس وجہ سے مانگتا ہے تاکہ اس کی دلیل اگر اس کو ٹھیک اور درست معلوم ہوئی تو اس جھوٹے نبی کو مانے تو ایسا شخص بھی دراصل ختمِ نبوت کا منکر اور کافر ہے۔

اب یہاں ختمِ نبوت کے دلائل نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کرتا ہوں، ان کو پڑھ لیجیے:

## دینِ اسلام کامل و مکمّل ہے اس لیے کسی بھی نبی کی کوئی ضرورت نہیں

دینِ اسلام کامل و مکمّل ہے، اس میں ترمیم و تبدیلی اور اس کی تشریح کے لیے کسی

نبی کی کوئی ضرورت نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ
نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

"آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو پورا کیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔" (مائدہ:۳)

مطلب یہ ہے کہ جو احکام دیے جانے تھے وہ سب دے دیے گئے، تمہارے لیے جو کچھ مقدر کیا گیا تھا وہ سب بھیجا جا چکا، اس سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کا دین، دینِ اسلام ہی سراسر نعمت ہے، اس پر عمل کر کے انسان دنیا و آخرت کے انعامات حاصل کر سکتا ہے۔

جو لوگ قرآن مجید کے اصولوں کے مطابق اپنے ظاہر و باطن اور اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کو بنا لیتے ہیں ایسے لوگ دنیا و آخرت کی ترقیات اور عروج حاصل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں ایسے لوگوں کو انعامات و ترقیات سے نوازتا ہے۔

## نبی کریم ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے

جب قرآن مجید اور سنتِ رسول ﷺ کی رو سے یہ حقیقت پوری طرح ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت قیامت تک تمام انسانوں کے لیے ہے تو اس کے بعد دوسرے نبی کو ماننا اسی مسلّمہ حقیقت اور قرآن مجید و سنت کا انکار ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ﴿۱﴾

"بڑی برکت ہے وہ ذات جس نے فرقان (یعنی حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والا قرآن مجید) اتارا تا کہ وہ تمام قوموں اور جہان والوں کے لیے ڈرانے (اور خبردار کرنے) والا ہو۔"

(فرقان:۱)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۷﴾

''ہم نے تو بس آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔'' (الانبیاء:۱۰۷)

اس آیتِ کریمہ سے ایک طرف یہ بات ثابت ہو گئی کہ آپ ﷺ کی نبوت ورسالت سارے جہاں والوں کے لیے ہے دوسری طرف اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ سلسلۂ نبوت کو نبی کریم ﷺ پر ختم کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کو ختم نہیں کیا، بلکہ نبی کریم ﷺ کی نبوت کی وجہ سے سارے جہان والوں پر ایسی کامل اور بھرپور رحمت نازل فرمائی اور اس کی رحمت نبوت کو ایسا عام و تام کر دیا کہ جس کے بعد کسی نبی کی ضرورت ہی نہیں رہی جیسا کہ سورج نکلنے کے بعد چاند ستاروں سے روشنی اور رہنمائی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی سب سورج کی عام و تام روشنی سے چھپ جاتے ہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا
وَّ نَذِیۡرًا وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ

''ہم نے تو تم کو تمام لوگوں کو خوشخبری دینے والا اور ڈرانے (خبر دار کرنے) والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔'' (سبا:۲۸)

اس آیتِ کریمہ میں کَافَّۃً لِّلنَّاس کا لفظ آیا ہے کَافَّۃٌ کا مادہ ''ك، ف، ف'' ہے اس کے معنی ہیں پکڑنا، سکڑنا اور روک دینا اور ''الکفّۃ'' کسی چیز کے آخری کنارے کو کہتے ہیں جس سے وہ آگے بڑھ نہیں سکتی۔

کافّۃ اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کی انتہا تک لے جاکر روک دے جیسے اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً کے اصل معنی یہ ہیں کہ تم اسلام میں وہاں تک پہنچ جاؤ جہاں تک اس کے شرائع اور تعلیمات کی آخری حدود ہیں یعنی اس کی انتہا تک پہنچ جاؤ یونہی تھوڑے سے دین پر چل کر رک نہ جاؤ جس کا حاصل یہ ہے کہ پورے کے پورے دینِ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

اور یہاں اس کے معنی یہی ہیں کہ ہم نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو آخری حد اور انتہاء تک (یعنی قیامت تک) کے تمام لوگوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ ہم نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو قیامت تک کے تمام لوگوں کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

## اگر نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو ضرور اس کا ذکر قرآن مجید میں ہوتا لیکن معاملہ برعکس ہے

تمام انبیا عَلَیْہِمُ السَّلَام نے اپنے بعد والے انبیا کی پیشگوئی کی ہے تاکہ ان کی امت آنے والے نبی اور انبیا کے منکر نہ ہو جائیں اور یہی از حد ضروری بھی تھا، لیکن قرآن مجید میں آنے والے کسی پیغمبر کی پیشگوئی موجود نہیں۔

اگر نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بعد کسی نبی کے آنے کا امکان بھی ہوتا تو قرآن مجید ضرور وضاحت کرتا تاکہ امتِ مسلمہ اور آئندہ آنے والی نسلیں کسی برحق نبی کی منکر نہ ہوں، لیکن قرآن مجید اس کے برعکس نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے پہلے انبیا اور کتابوں پر تو ایمان کو ضروری قرار دیتا ہے لیکن بعد میں آنے والے کسی نبی پر ایمان کا ذکر تک نہیں کرتا حالانکہ عمل کی رو سے پہلے انبیا پر ایمان لانا اس قدر ضروری نہیں جس قدر بعد میں آنے والے پر، کیونکہ جو شخص کسی موجودہ نبی پر ایمان سے محروم ہوا وہ تو ایمان و عمل دونوں سے محروم ہوا

اس لیے بعد میں آنے والے لوگ تو انہی بعد والے انبیا پر ایمان اور ان کی بتائی ہوئی تعلیمات کے پابند ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود قرآن مجید پہلے انبیا پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیتا ہے اور بعد میں آنے والے نبی کا بیان ہی چھوڑ کر یہ ثابت کرتا ہے کہ بعد میں کوئی نبی آنے والا نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَآ اُنزِلَ اِلَيكَ وَ مَآ اُنزِلَ
مِن قَبلِكَ ۚ وَ بِالاٰخِرَةِ هُم يُوقِنُونَ ۝۴

"اور جو ایمان لائے اس پر جو تم پر نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی ہے اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔" (البقرہ:۴)

قرآن مجید میں اس طرح کی آیتیں متعدد مقامات میں آئی ہیں اور سب میں من قبلك "تم سے پہلے" کا لفظ ہے لیکن بعد کا لفظ نہیں، پھر یہاں اس عقیدے کے فوراً بعد آخرت پر یقین کا ذکر آیا ہے اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ بس آخرت تک کے لیے کوئی نبی نہیں آئے گا۔

## قرآن وسنت نے بعد میں آنے والے کسی نبی کی واضح طور پر تردید کی ہے

اگرچہ مندرجہ بالا چند دلائل اس مدّعیٰ کے لیے کافی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں اور نہ کسی نبی کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو آخرت تک کے تمام انسانوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا ہے، تاہم قرآن وسنت نے اس پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ عقیدۂ ختمِ نبوت کو واضح طور پر بیان فرما کر سلسلۂ نبوت کے بند ہونے کا اعلان کیا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ
وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔'' (احزاب:۴۰)

''خاتَم'' تاء کے زبر اور ''خاتِم'' تاء کے زیر سے، دونوں اہلِ لغت کے نزدیک بالکل ہم معنی ہیں۔ قوم کے آخری فرد، کسی چیز کا انجام، اور خط کا آخری مہر، یہ سب اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔

یادرہے کہ خاتم کا لفظ اسٹمپ (STAMP) کے لیے نہیں آیا یعنی اس سے مراد وہ مہر نہیں جس سے کسی دستاویز وغیرہ کو پاس کیا جاتا ہے، بلکہ یہ لفظ سیل (SEAL) کے لیے آتا ہے، لفافے اور خط وغیرہ کسی تھیلی کو سیل کرنے کا مطلب اس کو آخری طور پر بند کرنا ہوتا ہے کہ اس کے بعد نہ کوئی چیز اس کے اندر سے باہر نکلے اور نہ باہر سے کوئی چیز اندر جائے۔

ذرا غور فرمایئے! سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا و مولانا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیا آئے ان سب کی ہدایت یہی رہی ہے کہ ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دی ہے، لیکن قرآن و سنت نے کسی نبی کے آنے کی پیشنگوئی تو کجا، بلکہ اس سلسلہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے واضح اور قطعی الفاظ کے ساتھ ختم کیا جن میں کسی قسم کی تاویل کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے ارشادات میں عقیدہ ختمِ نبوت کو بار بار نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ یہاں صرف ایک ہی ارشاد بطورِ نمونہ پیش کرتا ہوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

اِنَّ الرِّسَالَۃَ وَالنُّبُوَّۃَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ وَلَا نَبِیَّ

”رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اب میرے بعد نہ کوئی رسول ہو گا اور نہ ہی کوئی نبی۔“ (ترمذی)

## سلسلۂ نبوت بند کرنے کی وجہ سے قرآن مجید کے الفاظ اور معنی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اٹھائی

سلسلۂ نبوت کے بعد ضروری یہ تھا کہ قرآن مجید کے الفاظ اور اس کے معنی کو پوری طرح محفوظ کر لیا جائے اور قرآن مجید کے الفاظ کو ترمیم وتبدّل اور تحریف سے ہر قسم کی حفاظت کا سامان کر لیا جائے، اسی ضرورت اور حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ

”یقیناً ہم نے یہ یاد دہانی ونصیحت اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔“

(الحجر:۹)

قرآن مجید اور اس کے معنی وبیان یعنی سنت کی جو حفاظت اللہ تعالیٰ نے اس امت کے ذریعہ فرمائی ہے یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے کہ اس کا کوئی کافر بھی انکار نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا انکار دوپہر کے سورج کا انکار ہے۔

## نبوت کی صرف ایک ہی قسم ہے

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ نبوت کی بہت سی قسمیں نہیں، بلکہ اس کی صرف ایک ہی قسم ہے جو اپنی تمام شرائط وخصوصیات کے ساتھ قرآن وسنت میں بیان ہوئی ہے نبوت کو ظلی اور بروزی وغیرہ اصطلاحات میں تقسیم کرنا بالکل شیطانی اصطلاحات ہیں،

قرآن و حدیث میں ان کا کوئی ثبوت تو در کنار ان کا ادنیٰ اشارہ بھی موجود نہیں ہے، اگر ان کی کوئی حقیقت ہوتی تو اس موقع پر لوگوں کے اطمینان کے لیے نبی کریم ﷺ ضرور یہ فرماتے کہ لوگ نبوت کے ختم ہونے پر زیادہ پریشان نہ ہوں کیونکہ میرے بعد ظلیؔ اور بروزی انبیا آتے رہیں گے، غرض یہ کہ نبوت کی یہ تقسیم خالص شیطانی ہے، قادیانی وغیرہ لوگوں نے نبوت کی جو تقسیم کی ہے دراصل انہوں نے اپنے کفر کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ در حقیقت کفر میں اور زیادتی ہے، انہوں نے اس تقسیم سے اپنے کفر کو اور زیادہ غلیظ اور شدید بنادیا ہے اس لیے کہ اس تقسیم نے تو نبوت کے اس نظام ہی کو بالکل پلٹ کر کے رکھ دیا ہے جس پر دین کی عمارت قائم ہے۔

## عقیدۂ شفاعت

"شفعٌ" اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو کسی دوسری کے ساتھ ملادینا۔
شفاعت کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے ساتھ اس کی مدد کرتے ہوئے یا اس کی خبر گیری کرتے ہوئے مل جانا اس کے بعد شفاعت کے معنی سفارش اس لیے ہوگئے کہ اس میں کوئی شخص دوسرے شخص کی معاونت کے لیے اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے حق میں سفارش کرتا ہے۔ نیز جس کے حق میں کوئی گواہی دے اس کو بھی شفاعت کہتے ہیں کیونکہ وہ اس کی مدد کے لیے اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا، یہ شہادت اور گواہی جب دوسرے کے خلاف ہو تو اس دوسرے کے حق میں اس کے خلاف گواہی ہے، اسی طرح کسی کے حق میں دعا کرنا بھی اس کے لیے شفاعت ہے کہ یہ اس کے ساتھ مدد کر رہا ہے۔

## عقیدۂ شفاعت کا خلاصہ

اسلام کی رو سے آخرت میں جو شفاعت ہو گی اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس

کے لیے جس کے حق میں جس قدر سفارش کی اجازت پسند کریں وہی شخص صرف اسی شخص کے حق میں صرف اسی قدر شفاعت کرے گا جس قدر شفاعت کی اجازت اور حکم ہو۔

## مشرکین اور یہود ونصاریٰ کا عقیدۂ شفاعت

مشرکین، یہود ونصاریٰ اور بہت سی قوموں کا یہ عقیدہ رہا ہے اور ہے کہ ان کے مزعومہ شرکاء وشفعاء کو اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا ناز اور اختیار کا مقام حاصل ہے وہ جو بات چاہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے خود بڑھ کر اصرار کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ان کی ناز برداری اس قدر محبوب و مطلوب ہے کہ وہ بہر حال ان کی بات مانتا اور ان کی سفارش کو پوری طرح قبول کرتا ہے، اس لیے وہ ان پر نذر ونیاز چڑھاتے تھے اور ان کی پرستش کرتے یا کم از کم گناہ پر گناہ اس لیے کرتے تھے کہ آخرت میں ان کے سفارشی موجود ہیں اور وہ ان کو مصیبت اور عذاب سے نجات دلوائیں گے۔

## مشرکانہ عقیدۂ شفاعت کے اثرات

اس مشرکانہ عقیدۂ شفاعت کے ماننے والوں کی زندگی پر مندرجہ ذیل اثرات پڑے ہیں:

(۱) وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر مخلوق کی بندگی اور پرستش میں مبتلا ہو گئے۔

(۲) گناہوں سے بے خوف اور نڈر ہوئے اور اس عقیدے کی بنیاد پر بڑے بڑے جرائم کرتے رہے۔

(۳) وہ آخرت اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی سے بالکل بے خوف ہو کر دنیا کی زندگی کو اپنا لیا اور اسی میں کھو گئے اور اس طرح وہ دنیا کے چین وسکون اور آخرت کو برباد کر گئے۔ بلاشبہ اگر اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی اس قسم کی سفارش کی کوئی گنجائش مان لی

جائے تو آخرت کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہوئے اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ کی عدالت میں رشوت یا سفارش سے حق کو باطل اور باطل کو حق بنایا جاسکتا ہے تو یہ دنیا اندھیر نگری بن کے رہ جاتی ہے، پھر یہ کارخانہ مبنی بر حق و عدل کہاں رہتا ہے اور پھر اس کے خالق کو عادل اور حکیم کون مانے گا، قرآن مجید نے اس طرح کے مشرکانہ عقیدۂ شفاعت کی سختی سے تردید فرمائی اور عقیدہ شفاعت کے بارے میں ایسے اصول بتائے جو عین اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل و حکمت کے شایانِ شان ہیں۔

## عقیدۂ شفاعت کے بارے میں قرآن مجید کے اصول

عقیدۂ شفاعت کے بارے میں قرآن مجید نے جو اصولی باتیں بتائی ہیں ان کو پڑھ لیجیے:

(۱) شفاعت اور سفارش صرف وہی کر سکے گا جس کو خود اللہ تعالیٰ اجازت دے دے، کسی کو یہ جرأت اور اختیار قطعاً حاصل نہیں کہ وہ ازخود بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے کسی کی سفارش کے لیے منہ کھولے۔

(۲) سفارش بھی صرف اسی شخص کے بارے میں کرے گا جس کے متعلق اللہ تعالیٰ اجازت اور حکم فرمائے۔

(۳) جو سفارش کی جاتی ہے وہ حق و صواب ہی ہو گی، اس سفارش میں کسی باطل کو حق اور حق کو باطل نہیں قرار دیا جائے گا، بلکہ جو شخص جس قدر شفاعت کا حق دار ہو گا اس کے متعلق اسی قدر شفاعت ہو گی۔

## قرآن مجید کی رو سے عقیدۂ شفاعت

اب عقیدۂ شفاعت سے متعلق ان اصولوں کو قرآن مجید کے الفاظ میں پڑھ لیجیے:

(۱) لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ

”اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرسکتے مگر جتنا وہ چاہے۔“(بقرہ:۲۵۵)

اس آیتِ کریمہ میں اسی عقیدۂ شفاعت کے باطل ہونے کی طرف رہنمائی کی گئی جس میں عرب کے مشرکین اور بنی اسرائیل یہود ونصاریٰ کسی نہ کسی طرح سے مبتلا تھے۔

مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہے سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور اسی کے اختیار میں ہے اور سب کے سب اللہ تعالیٰ ہی کے محکوم اور غلام و تابعدار ہیں تو کس کی مجال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اس کے حضور میں سفارش کی جرأت کرسکے؟

(۲) ایک دوسرے مقام پر باطل عقیدے کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾

”اور وہ یہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اولاد بنائی ہے (وہ ان باتوں سے پاک ہے، بلکہ وہ (اللہ تعالیٰ کے) معزّز بندے ہیں وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کرتے وہ تو صرف اسی کے حکم کے انتظار میں رہتے ہیں بس اسی کے حکم کی ہی تعمیل کرتے ہیں) اللہ تعالیٰ ان کے آگے اور پیچھے

جو کچھ ہے سب سے باخبر ہے اور وہ سفارش نہیں کرسکتے مگر (صرف) اس کے لیے جس کے لیے اللہ تعالیٰ پسند کرے اور وہ اس کے جلال سے ڈرتے رہتے ہیں۔" (انبیا:۲۶-۲۸)

(۳) ایک جگہ فرماتے ہیں:

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَٰٓئِكَةُ صَفًّا ۖ لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿٣٨﴾

"جس روز روح (جبرائیل امین) اور دوسرے فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے کوئی نہ بولے گا مگر جس کو (رب) رحمن اجازت دے اور وہ بالکل ٹھیک بات کہے گا"۔ (النباء:۳۸)

ان آیتوں میں مشرکینِ عرب وغیرہ کے باطل عقیدۂ شفاعت کی تردید ہے، وہ فرشتوں کو اپنے زعم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اولاد اور بیٹیاں خیال کرکے پوجتے تھے اور ان کی سفارش سے دنیاوآخرت کی بگڑیاں بنانے کی توقع رکھتے تھے، اس باطل عقیدے کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بیوی بچوں جیسی نسبتوں سے پاک ہے، فرشتے وغیرہ اللہ تعالیٰ کی اولاد اور بیٹیاں نہیں، بلکہ وہ اس کے معزّز بندے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے خوف وخشیت سے لرزتے ہیں اور بطورِ خود وہ کوئی اقدام نہیں کرسکتے ہیں، وہ توصرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں جب ان کو خود اللہ تعالیٰ اجازت اور حکم فرماتے ہیں تب وہ زبان کھولتے ہیں، قیامت کے دن جبرائیل امین اور دوسرے ملائکہ رب العزت کے سامنے اس طرح صف بستہ حاضر ہوں گے جس طرح غلام اپنے آقا کے حضور میں ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے منتظر ہوں گے کوئی زبان کھولنے میں پہل نہیں کرے گا، بلکہ صرف وہی بات کرے گا جس کو رب رحمن کی طرف سے حکم اور اجازت ہوگی اور جس شخص کے لیے اجازت ہوگی وہ صرف اسی کے حق میں بولے گا اور وہ بھی صرف وہی بات کرے گا جو سراسر حق ہوگی۔

توجن کی خشیت اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ ہے ان سے یہ امید لگائے بیٹھنا کہ وہ اپنے اثرورسوخ اور ناز سے جس کو چاہے اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچالیں گے یا جس درجے اور مرتبے پر اس کو چاہیں گے سرفراز کریں گے یہ ایک محض احمقانہ آرزو اور جھوٹی امید ہے جس میں یہ مشرکینِ عرب اور دوسری اقوام مبتلا ہیں۔

(۴) سورۂ طٰہٰ میں اسی باطل عقیدے کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾
يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴿١١٠﴾

”جس دن سفارش نفع نہ دے گی مگر جس کو رب رحمٰن (خود) اجازت (اور حکم) دے اور جس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے وہ ان (سب) کے آگے اور پیچھے احوال کو جانتا ہے اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔“ (طٰہٰ:۱۰۹-۱۱۰)

ان آیتوں میں بھی وہی دو اصول بیان ہوئے ہیں کہ شفاعت وہی کرے گا جس کو خود اللہ تعالیٰ اجازت دیں اور وہ بھی اس کے لیے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کچھ کہنے کو پسند فرمائیں۔ ان آیتوں پر بار بار نظر ڈالیں قیامت میں جو سفارش اور شفاعت ہو گی وہ انہی دو اصولوں کے تحت ہو گی ورنہ کسی کی کیا مجال کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کسی کی سفارش کر سکے جبکہ وہ مالک بھی ہے اور ہر چیز سے باخبر بھی، جیسا کہ مذکورہ بالا آیتوں میں شفاعت کے بیان سے پہلے یا اس کے بعد یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ: یعلم ما بین ایدیھم ”اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے۔“

یہ باطل عقیدۂ شفاعت کے باطل ہونے کی دلیل اور وجہ بیان ہوئی ہے، ان مختصر

الفاظ میں باطل سفارش کی پوری تردید کے ساتھ اس کی وجہ بھی بتائی گئی، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو شخص کسی کی سفارش کو قبول کرتا ہے تو اس کی بڑی وجوہات دو ہوتی ہیں:

(۱) جو شخص کسی قاضی یا حاکم کی عدالت وغیرہ میں کسی کی سفارش کرتا ہے تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ اس حاکم یا قاضی کو اس کے حق دار ہونے کا یا اس شخص کے حالات کا پتہ نہ ہو تو سفارش کرنے والا قاضی اور حاکم کے سامنے اپنی سفارش کے ذریعے اس کی استعداد اور حالات سامنے لا کر کسی کام اور نوکری وغیرہ کا حق دار ہونا باور کرتا ہے یا اس کو کسی ناحق دعویٰ وسزا سے چھڑاتا ہے۔

(۲) کوئی قاضی یا حاکم کسی شخص سے اس کے وقار وکردار کی وجہ سے مرعوب ہو یا محبت یا رشتہ داری کی وجہ سے دبا ہوا ہو یا اس سے اس کی کوئی احتیاج وابستہ ہو مثلاً اس کی پارٹی کا کرتا دھرتا شخص ہو تو ایسی صورت میں قاضی یا حاکم دباؤ یا رعب یا مروت کی وجہ سے کسی کی سفارش کو قبول کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نہ تو بندوں کے حال سے بے خبر ہے کہ کوئی اس کے بارے میں بتائے اور نہ کمزور ہے کہ کسی سے مرعوب ہو وہ سب کا خالق مالک ہے، وہ نہ تو کسی سے کسی طرح مرعوب ہوتا ہے اور نہ کسی کے دباؤ میں آتا ہے، نہ اس کی کسی سے کوئی احتیاج وابستہ ہے، بلکہ تمام مخلوق اسی کی محتاج ہے۔

## اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی اور لامحدود اور مخلوق کا علم عارضی اور محدود ہے

ان آیتوں نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا کہ مخلوق کی کوئی صفت نہ اس کی ذاتی ہے اور نہ کلی اور غیر محدود، بلکہ جس طرح تمام مخلوقات کا وجود ہی اس کا ذاتی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو عدم سے وجود میں لایا ہے، اسی طرح اس کے اندر جو صفات اور قوتیں

ہوتی ہیں وہ بھی عارضی، جزوی اور محدود ہوتی ہیں اور یہ وہ حقیقت ہے جس کو قرآن مجید نے بار بار بیان فرمایا ہے اور یہاں بھی یہ فرمایا کہ انسان اللہ تعالیٰ کے علم میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتا مگر جتنا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اپنے خزانہ علم میں سے اس پر اتنا ہی کھول دیتا ہے۔

## اگر مخلوق کو سفارش کا اختیار دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے عدل وقسط کا نظام درہم برہم ہو جائے گا

اب ظاہر ہے کہ اگر کسی بھی مخلوق کو سفارش کا اختیار دے دیا جائے کہ وہ ازخود کسی کے حق میں جو سفارش کرے وہ ضرور قبول ہو گی تو اللہ تعالیٰ کے عدل وقسط کا نظام بالکل باطل اور درہم برہم ہو جائے گا کیونکہ مخلوق خواہ جن ہو یا انسان یا فرشتے سب کا علم محدود اور جزوی ہے اور کائنات اور تمام لوگوں پر تو کیا ایک انسان کی تمام حقیقتوں اور آگے پیچھے اور ظاہر وباطن کے تمام حالات پر بھی کسی کا علم محیط نہیں، دوسروں پر تو درکنار اس کا علم تو خود اپنے حالات اور اپنی ذاتی زندگی کے مصالح پر بھی محیط نہیں۔ایسی صورت میں اگر کسی بندے کو بھی سفارش کا آزادانہ اختیار مل جائے تو اللہ تعالیٰ کا نظامِ عدل وقسط درہم برہم ہو جائے گا۔

## صحیح عقیدۂ شفاعت کی حیثیت سچی گواہی کی سی ہے

مذکورہ بالا آیتوں میں فرشتوں اور انبیاعلیہم السلام وغیرہ کی شفاعت کو جن شرائط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے ان سے صاف صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شفاعت کی حیثیت سچی گواہی کی ہو گی یا اس سچی دعا کی جو خود اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں کسی کے لیے ڈال دے تو جو شخص جس وقت جس قدر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ٹھہرے گا اس وقت اس کے لیے اسی قدر گواہی یا دعا ہو گی، صحیح حدیثوں میں شفاعت کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ یہی ہے

کہ ایک معیَّن وقت پر لوگوں کے حساب وکتاب کی سفارش اور دعا ہوگی، بعض لوگ بلاحساب وکتاب جنت میں داخل ہوں گے اور بعض جہنم میں گر جانے کے بعد شفاعت کے مستحق ٹھہریں گے۔

## قرآن وحدیث کی روشنی میں شفاعت کی حیثیت

قرآن مجید کی تمام آیتوں اور صحیح حدیثوں کے ذخیرہ پر اگر غور سے نظر ڈالی جائے تو قیامت کی شفاعت کی حیثیت حق وصواب کے مطابق گواہی یا دعا ہے اور اس کی تصریح خود قرآن مجید نے بار بار فرمائی کہ انبیا علیہم السلام اور صلحا کو اور خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع کے بجائے شہید کہا گیا ہے ایک مقام پر انبیا علیہم السلام اور داعیانِ حق وغیرہ کی شفاعت کی حیثیت قرآن مجید نے یوں واضح فرمائی ہے:

وَ لَا يَملِكُ الَّذِينَ يَدعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ
اِلَّا مَن شَهِدَ بِالحَقِّ وَ هُم يَعلَمُونَ ﴿۸۶﴾

"اور اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے مگر وہ جو حق کی گواہی دیں گے اور جانتے ہوں گے۔" (زخرف:۸۶)

اس کا مطلب یہی ہے کہ مشرکین وغیرہ وہم اور خیال میں مبتلا ہیں کہ ان کے مولیٰ ومرجع ان کے مزعومہ شفعاء ہوں گے جو سفارش کرکے ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھڑالیں گے، ایسا ہرگز نہیں اس دن فیصلہ تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہوگا اور وہ بالکل حق کے مطابق فیصلہ فرمائے گا۔[1]

---

(1) واللّٰہُ یقضِی بالحقِّ ط والّذین یدعون من دونہ لا یقضون بشیْ "اور اللہ تعالیٰ بالکل حق کے مطابق فیصلہ فرمائے گا اور جن کو یہ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی بات کا بھی فیصلہ نہیں کریں گے۔" (المؤمن:۲۰)

اس دن سفارش کا اختیار تو کسی کو بھی نہیں ہو گا البتہ جن کو اللہ تعالیٰ اجازت دے وہ حق بات کی گواہی دیں گے اور وہ گواہی اسی بات کی ہو گی جس کو وہ جانتے ہوں گے۔

## شفاعتِ حق حقیقۃً شہادتِ حق اور دعائے حق ہے

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ قیامت کے روز انبیا علیہم السلام اور دینِ اسلام کے داعی شہداء اور صالحین جو شفاعت کریں گے یہ وہ سفارش نہیں جو دنیا میں حاکموں وغیرہ کے سامنے کی جاتی ہے، بلکہ یہ شہادتِ حق (حق کی گواہی) ہو گی اس کے حق میں جس کو وہ اچھی طرح جانتے ہوں یا ایسی دعا ہو گی جو سراسر حق و عدل کے عین مطابق ہو جسے اللہ تعالیٰ خود کسی کے دل میں ڈال دے گا۔

آخرت میں جب لوگوں کا مقدمہ پیش ہو گا تو پورے علم کے باوجود مزید تائید، مجرموں کی تذلیل اور نیکوکاروں کی عزت افزائی اور حوصلہ افزائی کے لیے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کھڑا فرمائیں گے جو قوموں کے حاکم تھے، انہوں نے ان کے سامنے حق پیغام پیش کیا پھر کسی نے مانا اور کسی نے نہیں، کسی نے ساتھ دیا اور کوئی مخالف بن کر کھڑا ہو گیا، تو وہ حق کے ماننے والوں نیکوکاروں کے حق میں گواہی دیں گے اور ان کی تائید کریں گے اور مشاہدے کی بنیاد پر سچا بیان دیں گے تو یہ کسی کے حق میں سفارش یا دعا کی قبولیت ایک طرف دعا کرنے والے اور سچے گواہ کے لیے باعث عزت ہے کہ اس کی گواہی کو اہمیت دی گئی تو دوسری طرف خود جس کے حق میں گواہی یا دعا کی جاتی ہے اس کے لیے بھی عزت کا مقام ہے کہ اس کی نیکوکاری کے لیے مزید گواہ پیدا ہوں گے اور جس کے حق میں جس قدر گواہ زیادہ ہوں وہ اسی قدر معزز ہو گا اور جن کے خلاف گواہی دے دی جائے یہ اس کے خلاف گواہی ہے اور اس میں مجرم کی مزید تذلیل اور رسوائی ہے کہ اس کے خلاف خود بندوں ہی

میں ان کے خلاف گواہ پیدا ہو گئے اور ان کا جرم اس قدر واضح اور ظالمانہ تھا کہ بندوں میں اس کا ظلم بندوں سے بھی نہ چھپ سکا۔

## عقیدۂ شفاعت کا خلاصہ

قرآن وسنت میں عقیدۂ شفاعت کا جو بیان آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ:

(۱) شفاعت کا مقام صرف پاکیزہ لوگوں انبیا، شہدائے امت، داعیانِ حق اور نیکوکاروں کو حاصل ہو گا، یہ ایک اکرام اور عزت کا مقام ہے جس پر اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کو سرفراز فرمائے گا جو اس اکرام اور اعزاز کے قابل ہوں گے۔ یہ مقامِ اعزاز واکرام تو ہے، مگر مقامِ اختیار واقتدار نہیں اور ان تمام کا سردار اور امام سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور شفاعتِ کبریٰ کا مقام بھی آپ ﷺ کو دیا جائے گا اور سب سے پہلے حکم اور اجازت بھی نبی کریم ﷺ کو ہو گی۔

(۲) یہ تمام حضرات بھی اللہ تعالیٰ کے حکم اور اجازت سے ہی شفاعت کریں گے۔

(۳) یہ تمام حضرات شفاعت بھی صرف ان لوگوں کے لیے کریں گے جن کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت مرحمت فرمائے۔

(۴) یہ اپنی شفاعت خواہ اس کی صورت شہادت ہو یا دعا، اس میں وہی بات کہیں گے جو بالکل حق ہو گی باطل کو حق یا بدی کو نیکی بنانا نہ ان کے شایانِ شان ہے اور نہ اللہ تعالیٰ علّام الغیوب کے آگے کوئی اس کی جسارت کر سکتا ہے۔

(۵) جن لوگوں نے شرک والی زندگی گذاری یا دعوائے ایمان کے باوجود دنیا سے بے ایمان اور منافق بن کر چلے گئے ہیں ان کے لیے کوئی شفاعت نہیں ہو گی۔

شفاعت تو ان لوگوں کے لیے مفید ہو گی جنہوں نے ایمان، عملِ صالح اور توبہ واصلاح کی زندگی گذاری ہو، لیکن کوتاہی، غفلت یا جذبات سے مغلوب ہو کر نیکیوں کے ساتھ غلطیاں بھی کی ہوں، اس طرح کے لوگوں کے لیے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق ٹھہریں گے اور نبی کریم ﷺ کی شفاعت پر بخش دیے جائیں گے اور بتدریج شفاعت اور جنت کے مستحق ٹھہریں گے۔

رہے وہ لوگ جنہوں نے شفاعت کے بل پر گناہوں کو اوڑھنا بچھونا بنار کھا ہے اور یہود کی طرح امید وار ہیں کہ سَیُغْفَرُ لَنَا ہم امتِ مرحومہ ہیں ہمارے سارے گناہ بخش دیے جائیں گے تو قرآن مجید اور حدیث کی روشنی میں اس خوش فہمی کے لیے کوئی گنجائش نہیں، بلکہ یہ خرابیِ عقیدہ کی رو سے اور بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

## عذابِ قبر حق ہے

مسلمان اس بات کو مانتے ہیں کہ موت انسان کو ختم نہیں کرتی، بلکہ یہ ایک پل ہے جس کے ذریعے وہ ایک دوسری زندگی کی طرف منتقل ہوتا ہے اور یہ قبر و برزخ کی زندگی ''آخرت'' کی پہلی منزل اور پہلا مرحلہ ہے۔

عالَمِ قبر و برزخ دنیا اور عالَمِ آخرت و قیامت کے درمیان ایک جہان ہے جو دنیا کے جہان سے بہت بڑا اور عالَمِ آخرت سے بہت چھوٹا ہے، اس میں نیک، صالح اور ایمان دار لوگ تو جنت کے مزے پالیتے ہیں اور کافر، مشرک، فاسق اور بدکار لوگ دوزخ کی تپش، بدبو اور سانپ بچھو کے ڈسنے وغیرہ عذاب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

غرض یہ قبر اور برزخ کی زندگی جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے لیے قبر کو جنت کا باغیچہ بنائے۔ (آمین)

## منکرینِ عذابِ قبر کے دلائل

جو لوگ بدترین گمراہی میں مبتلا ہیں، ان میں بعض وہ لوگ ہیں جو مدّعی اسلام ہو کر عذابِ قبر کے منکر ہیں، وہ عذابِ قبر سے انکار کے لیے سب سے بڑی اور مضبوط دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں قیامت حشر نشر سے متعلق ارشاد ہے کہ:

وَ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَاِذَا ہُمۡ مِّنَ الۡاَجۡدَاثِ اِلٰی رَبِّہِمۡ یَنۡسِلُوۡنَ ﴿۵۱﴾
قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا ؕۜ ہٰذَا مَا
وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ وَ صَدَقَ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۵۲﴾

”اور صور پھونکا جائے گا تو وہ یکایک قبروں سے اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے وہ کہیں گے ہائے افسوس (ہائے ہماری بدبختی) ہم کو ہماری خواب گاہ (یعنی قبر) سے کس نے اٹھایا، یہ وہی ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا۔“ (یٰس: ۵۱-۵۲)

مَرۡقَد سونے کی جگہ کو کہا جاتا ہے، یہاں اس سے مراد قبر اور برزخ کا عالَم ہے، منکرینِ عذابِ قبر کہتے ہیں کہ اگر عالَمِ قبر و برزخ میں عذاب ہوتا تو وہ قبر کو خواب گاہ کیوں کہتے؟

اس کا ایک جواب تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ پہلی بار صور پھونکنے سے لے کر دوسری بار صور پھونکنے تک ان پر نیند کی حالت طاری کر دی جائے گی۔

نیز اگر یہ نہ بھی ہو تب بھی اس کا جواب بالکل واضح ہے کیونکہ قیامت اور حشر و نشر کا منظر اس قدر ہولناک وہیبت ناک ہے کہ اس کے مقابلے میں عالَمِ برزخ کے مصائب اور عذاب کو جائے آرام سمجھیں گے جیسا کہ تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے کہ زیادہ مشقت اور تکلیف کے مقابلے میں کم اور معمولی تکلیف راحت اور نعمت سمجھی جاتی ہے، ایک شخص

خواب میں دیکھ رہا ہے کہ وہ تیز دھوپ میں چل رہا ہے جب آنکھ کھل گئی تو دیکھا کہ آگ کی طرح گرم لوہے کی پلیٹوں پر کھڑا ہے اور لوہے کی سیخوں سے داغا بھی جارہا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ شخص اس خواب کی تکلیف کو نعمت وراحت ہی سمجھے گا اور یہی کہے گا کہ کاش میں حسب سابق سویا ہوتا۔

یہی حال فُسّاق وفُجار کا ہوگا اگرچہ یہ عالَم برزخ میں جہنم کی تپش، اس کی بدبو اور سانپ بچھو کے ڈسنے میں گرفتار کیے جائیں گے اور وقتاً فوقتاً ان کو ڈرایا جائے گا، لیکن جب موت کی نیند سے وہ بیدار ہوجائیں گے تو یکایک ان کے سامنے پہلے سے کروڑوں گنا زیادہ ہیبت ناک اور ہولناک منظر ہوگا اور وہ اپنے آپ کو ایسی زمین پر پائیں گے جو آگ سے زیادہ گرم ہوگی اور ان کے سروں پر سورج ہوگا جس کی وجہ سے ان کے دماغ کھولتے ہوں گے اور جوش مار رہے ہوں گے۔

بہر حال منکرین کا اس طرح کی آیتوں سے استدلال بے سود اور غلط ہے۔

## قرآن مجید کی روشنی میں عذاب وثوابِ قبر

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں عالمِ برزخ وقبر کی نعمتوں اور عذاب کا ذکر موجود ہے، ان میں سے چند آیتیں یہ ہیں:

وَ لَو تَرٰٓی اِذِ الظّٰلِمُونَ فِی غَمَرٰتِ المَوتِ وَ المَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوٓا اَیدِیہِم ۚ اَخرِجُوٓا اَنفُسَکُم ؕ اَلیَومَ تُجزَونَ عَذَابَ الھُونِ بِمَا کُنتُم تَقُولُونَ عَلَی اللّٰہِ غَیرَ الحَقِّ وَ کُنتُم عَن اٰیٰتِہٖ تَستَکبِرُونَ ﴿۹۳﴾

”اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت جب کہ یہ ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے کہ لاؤ اپنی جانیں نکالو آج تم کو ذلت والا عذاب دیا جائے گا

بوجہ اس کے کہ تم اللہ تعالیٰ پر ناحق (جھوٹی) باتیں کہتے تھے اور تم اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے متکبرانہ اعراض کرتے تھے۔" (انعام:۹۳)

(۲) وَ لَو تَرَى اِذ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا ۙ المَلٰٓئِكَةُ يَضرِبُونَ وُجُوهَهُم وَ اَدبَارَهُم ۚ وَ ذُوقُوا عَذَابَ الحَرِيقِ ﴿۵۰﴾

"اور اگر تم دیکھتے جب کہ فرشتے ان کفر کرنے والوں کی جان قبض کرتے ہیں مارتے ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر اور یہ کہتے ہوئے کہ اب چکھو مزا جلنے کے عذاب کا۔"

(سورۃ الانفال:۵۰)

(۳) حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتهُم رُسُلُنَا يَتَوَفَّونَهُم ۙ قَالُوٓا اَينَ مَا كُنتُم تَدعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ ؕ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلٰٓى اَنفُسِهِم اَنَّهُم كَانُوا كٰفِرِينَ ﴿۳۷﴾

"یہاں تک کہ جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی جان لینے کے لیے ان کے پاس آجائیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے (آج) وہ کہاں ہیں تو وہ کہیں گے کہ (آج تو ان کا کوئی پتہ نہیں انہوں نے ہماری کوئی مدد نہیں کی) وہ سب ہم سے کھوگئے اور وہ اپنے اوپر اقرار کریں گے کہ بلاشبہ وہ انکار کرنے والے تھے۔" (الاعراف:۳۷)

مذکورہ بالا آیتوں سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ موت کے وقت سے ہی بدکاروں پر عذاب مسلّط کیا جاتا ہے اور فرشتے ان کو مارتے پیٹتے ہیں اور ان کو ڈانٹ پلاتے ہیں اور دوزخ کا کچھ مزہ چکھاتے ہیں اور یہ کہ انسانی روح فرشتوں کی باتیں سنتی ہے اور کلام بھی کرتی ہے اور غم وتکلیف کو بہت شدت سے محسوس کرتی ہے۔

(۴) ظالم متکبر لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الَّذِينَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ اَنفُسِهِمْ ۖ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا
نَعْمَلُ مِن سُوٓءٍ ۚ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٢٨﴾ فَادْخُلُوٓا
اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِينَ فِيهَا ۚ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٢٩﴾

”جن لوگوں کو فرشتے اس حال میں وفات دیں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہوں گے تو اس وقت (ان کا سارا نشہ ختم ہو کر) وہ سپر ڈال دیں گے (اور نہایت لجاجت کے ساتھ جھوٹی معذرت پیش کریں گے) کہ ہم تو کوئی برائی نہیں کرتے تھے (فرشتے جواب دیں گے) ہاں بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے تھے پس اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہو پس کیا ہی برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا“۔
(نحل:۲۸-۲۹)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ متقی پرہیز گار نیکوکار لوگوں کا انجام بیان کر کے فرماتے ہیں کہ:

الَّذِينَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِينَ ۙ يَقُولُونَ سَلٰمٌ
عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٢﴾

”جن لوگوں کو فرشتے پاکیزہ حالت میں وفات دیتے ہیں وہ (فرشتے ان کا استقبال کر کے) کہتے ہیں سلام علیکم یعنی آپ لوگوں پر سلامتی ہو جنت میں داخل ہو جاؤ اپنے نیک اعمال کے بدلے۔“ (نحل:۳۲)

مذکورہ بالا آیتوں سے عذابِ قبر اور ثوابِ قبر دونوں ثابت ہیں، بدکار لوگ حواس باختہ ہوں گے سراسیمگی کے شکار ہوں گے، فرشتے ان کو جہنم میں داخل ہونے کی پیشگی خبر دیتے ہیں اور ان کے سامنے عذاب کا منظر لایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس نیکوکاروں

کا ملائکہ استقبال کرتے ہیں، ان کے سامنے آدابِ سلام بجالاتے ہیں اور جنتی ہونے کی پیشگی مبارک باد دیتے ہیں۔

سورۃ المؤمنون میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿٩٩﴾ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿١٠٠﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ ﴿١٠١﴾

”یہاں تک ان میں سے کسی پر موت آتی ہے تو وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار مجھ کو (دنیا میں پھر) واپس بھیج دیجیے تاکہ جس (مال و دولت اور زمین وغیرہ) کو میں چھوڑ آیا ہوں اس میں کچھ نیکی کماؤں (ان سے کہا جائے گا کہ ایسا) ہرگز نہیں (ہوگا) یہ محض ایک بات ہے جو وہ کہتا ہے (جس کا کوئی بھی فائدہ نہ ہوگا) اور ان کے آگے ایک برزخ یعنی پردہ ہوگا اس دن تک کے لیے جس دن وہ اٹھائے جائیں گے پس جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن نہ نسب کام آئے گا اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا۔“ (المؤمنون:۹۹--۱۰۱)

ان آیتوں سے بھی یہ بات واضح ہے کہ موت کے وقت بدکاروں کے سامنے عذاب کا منظر لایا جائے گا وہ افسوس بھی کریں گے، دنیا میں دوبارہ بھیجے جانے کی درخواست بھی کریں گے، لیکن اس وقت یہ سب کچھ بے سود ثابت ہوگا اور ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان پر یہ عذاب قیامت تک رہے گا اور دوبارہ اٹھائے جانے کے بعد وہ شدید ترین عذاب سے دوچار ہوں گے جیسا کہ اس کے بعد والی آیتوں کے مضمون سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ (دیکھیے سورۃ المؤمنون:۱۰۲---۱۰۸)

(٦) فرعون اور اس کے پیروکاروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ

”آگ ہے جس پر وہ صبح وشام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہو گی (اس دن فرشتوں کو حکم ہو گا کہ) آلِ فرعون کو بدترین عذاب میں داخل کرو۔“ (المؤمن:۴۶)

اس آیت میں اس عذاب کی تفصیل ہے جو قبر وبرزخ کی زندگی سے متعلق ہے، چنانچہ یہاں بدکاروں کے لیے مرنے کے بعد صاف صاف الفاظ میں عذاب کے دو مرحلوں کا بیان ہے ایک مرنے کے بعد قیامت تک کا عذاب دوسرا آخرت کے عذاب کا۔ پہلا عذاب بعد میں آنے والے عذاب کی نسبت کم درجے کا ہے وہ یہ کہ ان کو صبح وشام دوزخ کی آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور جب قیامت ہو جائے گی تو ان کو ان کے کرتوتوں کی وجہ سے شدید ترین عذاب دیا جائے گا جو ان کے لیے لکھا گیا ہے، یہ عذاب اس قدر شدید ہو گا کہ اس کے مقابلے میں عالَمِ قبر وبرزخ کا عذاب آرام وراحت معلوم ہو گا جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

(٧) سورۂ یٰسین میں ایک شخص کا واقعہ ہے کہ جب اس کی قوم نے رسولوں کی دعوت کو ٹھکرایا تو اس نے رسولوں کی تائید وحمایت کی اور قوم کے لوگوں کو نصیحت کی اور لوگوں کو رسولوں کی پیروی کی دعوت دی تو قوم نے اس کی بات کو آبائی دین اور قوم کی دشمنی پر محمول کر کے اس کو شہید کر ڈالا، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝۲۶

بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝۲۷

"(اس مرد مؤمن کو) حکم ہوا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ اس نے کہا کاش میری قوم جانتی کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا اور مجھے عزت والوں میں شامل کر دیا۔" (یٰسین:۲۶-۲۷)

اس مردِ مؤمن کو اس کے مرنے کے ساتھ ہی جنت کی بشارت دی گئی اور اس کو عزت کے مقامات میں داخل کر دیا گیا، اس نے تمنا بھی کی کہ کاش میری قوم میرے نیک انجام کو جان لیتی تو وہ حق کی مخالف نہ بنتی، ظاہر ہے کہ نیکو کاروں کی دنیا والوں کے ساتھ دلچسپی اور ان کے لیے تمنا عالمِ قبر سے متعلق ہے، ورنہ قیامت کے روز تو ہر ایک اپنے نیک یا بد انجام کو دیکھ لے گا، لہٰذا یہ دلچسپی اور تمنا اس وقت صحیح ہو گی جب کہ اس کی قوم والے دنیا میں ہوں اور یہ مرد مؤمن عالمِ برزخ میں جیسا کہ بعد والی آیتوں میں اس حقیقت کی اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے۔

(۸) جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَا تَحسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ اَموَاتًا ط بَل اَحيَآءٌ عِندَ رَبِّهِم يُرزَقُونَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِينَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللهُ مِن فَضلِهٖ وَ يَستَبشِرُونَ بِالَّذِينَ لَم يَلحَقُوا بِهِم مِّن خَلفِهِم اَلَّا خَوفٌ عَلَيهِم وَ لَا هُم يَحزَنُونَ ﴿۱۷۰﴾

"اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردہ خیال نہ کرو بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں ان کو رزق مل رہا ہے وہ خوش ہیں اس پر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو دیا ہے اور وہ ان لوگوں کے بارے میں خوشخبری حاصل کر رہے ہیں جو ہنوز دنیا میں ان کے پیچھے (رہ گئے) ہیں اور اب تک ان سے نہیں ملے ہیں (اور دنیا میں وہ انہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں) ان پر نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔ (آل عمران:۱۶۹-۱۷۰)

ان آیتوں میں عالَمِ قبر و برزخ کی خوشیوں اور نعمتوں کا بیان ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق اور روزی مل رہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر فرحان و شادان ہیں صرف یہی نہیں، بلکہ ان کی دلچسپیاں دنیا والوں کے ساتھ بھی باقی ہیں اور اپنے پیچھے چھوڑی ہوئی اولاد اور ان بھائی بندے جو ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور شہادت کے آرزومند ہیں اگرچہ وہ اب تک دنیا میں ہیں اور ابھی ان سے ملے نہیں ان کے بارے میں بھی ان کو یہ بشارت مل رہی ہے کہ وہ بھی عنقریب ان سے ملیں گے اور ان کو بھی انہی کی طرح پُر سکون اور پُر لذت اور راحتوں کا مقام حاصل ہو گا جہاں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ غم۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ عالَمِ قبر و برزخ میں تمام انسانی روحیں زندہ رہتی ہیں خواہ بدکاروں کی روحیں ہوں یا نیکوکاروں کی، لیکن بدکاروں کی زندگی چونکہ تکلیف مصیبت اور عذاب میں ہوتی ہے اس وجہ سے وہ قابلِ ذکر نہیں جیسا کہ اسی طرح کے الفاظ ہماری زبانوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں کہ "فلاں زندہ آدمی ہے" اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دوسرے لوگ جو دنیا میں پھر رہے ہیں وہ زندہ نہیں، بلکہ ہم اس شخص کو زندہ کہتے ہیں جس کی زندگی قابلِ ذکر ہوتی ہے۔ پھر مؤمن کی برزخی زندگی اور عالَمِ برزخ میں ان کی خوشی و شادمانی کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بے شمار درجات ہیں اور جو لوگ راہِ حق میں شہادت کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں ان کی برزخی زندگی کی کامیابیوں، شادمانیوں، ان کی خوشیوں اور ان کو جو رزق و نعمتیں دی جاتی ہیں ان کا تصور بھی ہم اس دنیا میں نہیں کر سکتے اور حضرات انبیا علیہم السلام کی زندگی تو اور بھی زیادہ ترقی پذیر ہو گی، ان کو جو نعمتیں ملتی ہوں گی ان کا اندازہ لگانا اس دنیا میں ناممکن ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ عذاب و ثواب کے لحاظ سے جس طرح قیامت کے

روز لوگوں کے ادنیٰ سے اعلیٰ تک بے شمار درجات ہوں گے اسی طرح برزخ، قبر اور برزخ کی زندگی کا بھی حال ہے۔

## عذاب وثوابِ قبر حدیث کی روشنی میں

نبی کریم ﷺ کے ارشادات، آپ ﷺ کی دعاؤں اور مناجات میں عذاب وثوابِ قبر کا اس قدر ذکر آیا ہے کہ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو اس باب سے متعلق صرف حدیث کے ذخیرہ سے ایک مستقل اور ضخیم کتاب بن جائے گی، چونکہ یہاں صرف ثواب اور عذاب قبر کو احادیث کی روشنی میں بتلانا مقصود ہے اس لیے چند احادیث میں صرف قبر وبرزخ کے متعلق مضمون کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ مقصد بھی حاصل ہو اور مضمون بھی زیادہ طویل نہ ہو۔

لٰہذا اب اس موضوع سے متعلق احادیث سے جو کچھ ثابت ہے ان میں سے بعض مضامین کا خلاصہ پڑھ لیجیے:

(۱) قبر میں دو فرشتے مردوں سے سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ تم اس شخص (یعنی محمد ﷺ) کے بارے کیا کہتے ہو؟ اس کے جواب میں مؤمن شخص کہے گا میرا رب اللہ ہے، میرا دینِ اسلام ہے اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اس کے برعکس کافر منافق اور بدکار ٹھیک جواب نہیں دے سکیں گے، وہ ہر سوال کے جواب میں یہ کہے گا ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔ (بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد، مشکوٰۃ)

(۲) مؤمن جنتی کو جنت میں اس کا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے اور کافر، منافق، بدکار دوزخی کو جہنم میں اس کا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے۔ (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ)

(۳) ہر مرنے والے کو عالمِ قبر اور برزخ میں صبح وشام اس کا ٹھکانا اس کے سامنے لایا جاتا ہے، جنتی کو جنت اور دوزخی کو دوزخ میں اس کا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے۔ (بخاری ومسلم ومشکوٰۃ)

(۴) کافر و منافق کو لوہے کے گرزوں سے اس زور سے مارا جاتا ہے کہ چیخنے اور چلانے کی آوازیں جنوں اور انسانوں کے علاوہ اس کے قریب کی ہر شئی سنتی ہے۔ (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ)

(۵) مؤمن کے لیے عالَمِ قبر و برزخ میں جنت کا فرش بچھایا جاتا ہے اور جنت کی پوشاک پہنائی جاتی ہے، اس کے واسطے جنت کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اس کے پاس جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آتی ہیں اور حد نظر تک اس کی قبر و برزخ کشادہ کر دی جاتی ہے۔

اس کے برعکس کافر، منافق اور بدکار کے لیے آگ کا فرش بچھا دیا جاتا ہے اور آگ کا لباس پہنایا جاتا ہے اور اس کے واسطے دوزخ کی طرف سے ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اس کے پاس گرم ہوائیں اور بدبوئیں آتی ہیں اور اس کی قبر اس قدر تنگ کر دی جاتی ہے کہ اس کی دونوں طرف کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں اور اس پر اندھے بہرے فرشتوں کو مقرر کیا جاتا ہے، وہ اس کو لوہے کے گرز سے اس طرح مارتے ہیں کہ اس کی چیخیں مشرق سے مغرب تک تمام مخلوقات سنتی ہیں مگر جن اور انسان نہیں سنتے۔

(احمد، ابوداؤد، مشکوٰۃ)

(۶) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب میت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو قبر کے پاس کھڑے ہو کر لوگوں سے فرماتے، اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو اور ثابت قدم رہنے کی دعا مانگو (کہ اللہ تعالیٰ اس کو سوال وجواب میں ثابت قدم رکھے) اس لیے کہ اس وقت اس سے سوال کیا جاتا ہے۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

(۷) عالَمِ قبر و برزخ میں کفار اور منافقین پر ستر (۷۰) یا ننانوے (۹۹) اژدہے بھی مسلّط کر دیے جاتے ہیں جو اس قدر زہریلے ہوتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی اس زمین پر پھنکار مارے تو دنیا کی سرزمین سبزہ اُگانے سے محروم ہو جائے۔ (ترمذی، دارمی، مشکوٰۃ)

(۸) مؤمن اور پکے نمازی بندے کے پاس جب سوال کرنے والے فرشتے منکر نکیر آتے ہیں تو اس وقت اس کو ایسا معلوم ہو گا کہ جیسے سورج غروب ہو رہا ہے (اور اس کو کوئی غم و فکر نہ ہو گی) وہ تو نکیرین سے کہے گا کہ مجھے چھوڑ دو تا کہ میں نماز پڑھوں۔ (یعنی میری نماز فوت ہو رہی ہے)۔ (ابن ماجہ، دیکھیے مرنے کے بعد کیا ہو گا:۱۹)

(۹) نبی کریم ﷺ ہمیشہ نماز کے بعد عذاب قبر سے پناہ مانگتے تھے اور مسلمانوں کو بھی یہی ہدایت فرمائی ہے کہ قبر کے عذاب سے پناہ مانگیں۔ (بخاری و مسلم و مشکوٰۃ)

(۱۰) مؤمن کی روح جب اپنے جاننے والے مؤمنین کی روحوں سے ملتی ہے تو وہ مؤمنین ایسے خوش ہوتے ہیں جیسا کہ کسی غائب کے آنے پر اس کے رشتہ دار خوش ہوتے ہیں، پھر وہ اس سے دنیا میں چھوڑنے والے رشتہ داروں کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ فلاں کا کیا حال ہے اور یہ بتاتا ہے کہ فلاں اس طرح اور فلاں اس طرح ہے۔

(احمد، النسائی، دیکھیے مرنے کے بعد کیا ہو گا:۲۲)

(۱۱) شہداء کی روحیں جنت کے باغیچوں میں چلتی پھرتی ہیں اور جنت کے باغیچوں سے کھاتی پیتی ہیں، واپس آکر عرش کے نیچے سونے کی قندیلوں میں آرام کرتی ہیں۔

(مسلم، مشکوٰۃ)

(۱۲) اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت پانے والا جب عالمِ برزخ میں اپنی عزت اور شان و شوکت کو دیکھے گا تو وہ آرزو کرے گا کہ کاش وہ دنیا میں پھر لوٹے اور دس بار اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارا جائے۔ (بخاری و مسلم و مشکوٰۃ)

مذکورہ بالا قرآن مجید کی آیات اور احادیثِ مبارکہ سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ روح نکلنے کے بعد عالَمِ قبر اور برزخ کا عذاب و ثواب حق ہے اور اس عذاب یا ثواب کے اعتبار سے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک لوگوں کے بے شمار درجات ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ مذکورہ بالا آیتوں اور احادیث سے چند مزید باتیں وضاحت کے ساتھ ثابت ہو گئیں وہ یہ ہیں:

(ا) ان تمام آیتوں سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ موت کی سختیوں اور موت کے وقت ہی فرشتے سامنے آجاتے ہیں اور موت ہی کے وقت سے عذاب وثواب کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

(ب) ان آیتوں اور حدیثوں سے معلوم ہوا کہ عالَمِ قبر وبرزخ میں جہنم اور جنت کا کچھ نہ کچھ مزہ چکھا دیا جاتا ہے۔بدکاروں کو جہنم کی گرمی اور بدبو وغیرہ، جبکہ نیکوکاروں اور پاکبازوں کو فرشتے سلام کرتے ہیں، ان کو جنت کی بشارت سناتے ہیں اور ان کو جنت کے آرام، لذت وراحت اور نعمتوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ملتا رہتا ہے۔

(ج) ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عالَمِ قبر وبرزخ میں وہاں کی روحانی مخلوق کے ساتھ انسانوں کی روحیں باتیں بھی کرتی ہیں اور فرشتوں وغیرہ کی باتیں سنتی بھی ہیں اور فرشتوں اور دوزخ وغیرہ کو دیکھتی بھی ہیں۔

اور وہ عالَمِ قبر وبرزخ میں درد، خوف، غم یا لذت، راحت، خوشی وسکون کو بھی شدت سے محسوس کرتی ہیں۔

(د) مؤمنین کی پاکیزہ روحوں کی دلچسپیاں دنیا والوں کے ساتھ بھی رہتی ہیں اور ان کے بارے میں خوشخبری سے خوش بھی ہوتی ہیں اور نئے آنے والے مؤمنین کی روحوں سے دنیا والوں کی حالت بھی پوچھتی ہیں۔

(ھ) جس طرح قیامت میں جنت ودوزخ میں خوشی وراحت اور تکلیف وغم کے لحاظ سے لوگوں کے ادنیٰ سے اعلیٰ تک بے شمار درجات ہوں گے، اسی طرح قبر اور برزخ کی

زندگی میں بھی لوگوں کو مختلف قسم کی خوشیاں نعمتیں یا مصیبتیں اور عذاب ملے گا اور ان کے بھی ادنی سے اعلیٰ تک بے شمار درجات ہوں گے۔

## عالمِ قبر ہر جگہ ہو سکتا ہے

عالمِ قبر سے صرف مٹی کے چند فٹ کا گڑھا مراد نہیں، بلکہ یہ قیامت اور دنیا کے درمیان ایک ایسا عالم ہے جو اس دنیا سے بہت زیادہ بڑا اور آخرت کے مقابلہ میں چھوٹا ہے، یہ عالم دنیا اور آخرت کے درمیان ایک برزخ (یعنی آڑ) ہے، اس لیے اس کو عالَمِ برزخ بھی کہا جاتا ہے، یہ عالَم صرف ان مردوں کے ساتھ مخصوص نہیں جو قبروں میں دفن کیے جاتے ہیں، بلکہ یہ عالم ہر جگہ ہو سکتا ہے خواہ کسی کے جسم کو دریا میں بہا دیا جائے یا اس کے جسم کو آگ میں جلا دیا جائے یا کسی کو درندے کھا جائیں۔

غرض یہ کہ جس شخص کا جسم جہاں بھی ہو اگرچہ اس کے جسم کے ذرات دھواں ہو کر پوری دنیا میں پھیل جائیں بہرحال ہر مرنے والا اسی عالَمِ قبر و برزخ میں پہنچ جاتا ہے اور اس سے سوال و جواب ہوتا ہے۔

مؤمن لوگوں کی روحیں عِلیّین میں حشر تک رہیں گی اور گمراہ، کافر بدکاروں کی روحیں سِجّین میں حشر تک رہیں گی، یہ دونوں مقامات جو عالَمِ قبر و برزخ میں ہیں بمنزلہ دو مسافر خانوں کے ہیں جہاں قیامت تک نیک روحیں خوشیوں اور راحت میں رہیں گی اور بری اور بدروحیں تکلیف و عذاب میں پڑی رہیں گی اور قرآن مجید و احادیث میں قبر کا جو ذکر آیا ہے وہ صرف اس لیے کہ عرب قریش یہود و نصاریٰ وغیرہ قوموں کا عام رواج مردوں کو دفن کرنے کا تھا اور لوگ صرف اسی طریقے کو جانتے تھے۔

اس لیے قرآن مجید اور احادیث میں عام طور پر اسی لفظ قبر کو اختیار کیا گیا ہے۔

## عالمِ قبر وبرزخ میں عذاب وثواب کی کیفیت

عالمِ قبر وبرزخ میں مردہ کی روح کو جو ثواب یا عذاب ملتا ہے، اس کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں، البتہ قرآن وحدیث کے مجموعے سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ عالمِ قبر میں جو عذاب یا ثواب کے مناظر پیش آتے ہیں وہ براہِ راست ارواح اور نفوس کو پیش آتے ہیں، لیکن اس عالم میں جو کچھ ان پر گذرتا ہے وہ انسان کو اسی طرح دکھائی دیتا ہے جیسا کہ ہو بہو یہ تکلیف یا راحت وخوشی اس کے اس جسم خاکی کو مل رہی ہے، یہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ نیند کی حالت میں خواب دیکھنے والا اپنے آپ کو تکلیف، غم یا راحت اور خوشی میں دیکھتا ہے، اس کو اپنے خاکی جسم سے بھی ایک قسم کی نسبت اور تعلق حاصل ہوتا ہے، یہ نسبت وتعلق ان کو بھی حاصل ہوگا جن کو جلا کر راکھ اور دھواں فضاؤں میں پھیل جاتا ہے اور ان کو بھی جن کا جسم سمندر اور دریاؤں یا بیابانوں کی مٹی میں خلط ملط ہو کر پانی یا خاک کا حصہ بن جاتا ہے۔

عالمِ قبر وبرزخ میں مرنے والوں پر جو کچھ گذرتی ہے اس کی کیفیت کے بارے میں علمائے اسلام نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ نے یوں پیش کیا ہے:

”انسان دو چیزوں سے مرکب ہے ایک جسم جو ظاہر ہے اور نظر آتا ہے، دوسری روح جو اگرچہ آنکھوں سے نظر نہیں آتی لیکن اس کے ہونے کا ہم سب کو یقین ہے، پھر انسان کے ان دونوں جزوں کا باہم تعلق اس دنیا میں اس طرح ہے کہ تکلیف ومصیبت یا راحت ولذت کی جو کیفیت یہاں آتی ہے وہ براہِ راست جسم پر آتی ہے اور روح اس سے تبعاً متاثر ہوتی ہے مثلاً انسان کو چوٹ لگتی ہے وہ زخمی ہوتا ہے یا مثلاً وہ کہیں آگ سے جل جاتا ہے تو

ظاہر ہے کہ چوٹ اور آگ کا تعلق براہِ راست اس کے جسم سے ہوتا ہے، لیکن اس کے اثر سے روح کو بھی دکھ ہوتا ہے، اسی طرح کھانے پینے سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ بھی براہِ راست جسم ہی کو حاصل ہوتی ہے لیکن روح بھی اس سے لذت حاصل کرتی ہے۔

الغرض اس دنیا میں انسان کے وجود اور اس کے حالات میں گویا جسم اصل ہے اور روح اس کے تابع ہے، لیکن قرآن وحدیث میں عالمِ برزخ کے متعلق جو کچھ بتلایا گیا ہے اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں معاملہ اس کے برعکس ہوگا، یعنی اس عالم میں جس پر جو اچھی بری واردات ہوں گی وہ براہِ راست اس کی روح پر ہوگی اور جسم اس سے تبعاً متاثر ہوگا۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے (شاید اسی لیے کہ اس حقیقت کا سمجھنا ہمارے لیے آسان ہو جائے) اس دنیا میں بھی اس کا ایک نمونہ پیدا کر دیا ہے اور وہ عالمِ رؤیا یعنی خواب ہے عقل وہوش رکھنے والا ہر انسان اپنی زندگی میں بار بار ایسے خواب دیکھتا ہے جن میں اس کو بڑی لذت ملتی ہے یا بڑی تکلیف ہوتی ہے۔۔۔ لیکن خواب میں یہ لذت یا تکلیف براہِ راست دراصل روح کے لیے ہوتی ہے اور جسم تبعاً متاثر ہوتا یعنی خواب میں آدمی مثلاً جب یہ دیکھتا ہے کہ وہ کوئی لذیذ کھانا کھا رہا ہے، تو صرف یہ ہی نہیں دیکھتا کہ میری روح ہی کھا رہی ہے یا خیالی قوت ہی کھا رہی ہے، بلکہ اس وقت وہ یہی دیکھتا ہے کہ بیداری کی طرح وہ اپنے اس جسم والے منہ سے کھا رہا ہے جس سے روزانہ کھایا کرتا ہے اسی طرح خواب میں اگر وہ یہ دیکھتا ہے کہ کسی نے اس کو مارا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کی روح کو مارا گیا، بلکہ وہ اس وقت یہی دیکھتا ہے کہ مار اس کے جسم پر پڑی اور اس کے جسم پر اس وقت ویسی ہی چوٹ لگی جیسی بیدار میں مار پڑنے سے لگتی ہے حالانکہ واقعہ میں جو کچھ گذرتا ہے وہ خواب میں دراصل روح پر گذرتا ہے اور جسم اس سے تبعاً متاثر ہوتا ہے البتہ کبھی کبھی جسم کا یہ تاثر

اتنا محسوس ہو جاتا ہے کہ آدمی بیدار ہونے کے بعد جسم پر اس کے نشانات اور اثرات بھی پاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔

الغرض نیند کی حالت میں اچھے یا برے خواب دیکھنے والے شخص پر جو کچھ گذرتا ہے اس کی نوعیت یہی ہے کہ وہ براہِ راست اور اصلی طور پر روح پر گذرتا ہے اور جسم پر اس کا اثر تبعاً پڑتا ہے اسی لیے خواب دیکھنے والے کے قریب والا آدمی بھی اس کے جسم پر کوئی واردات گذرتے ہوئے نہیں دیکھتا کیونکہ ہم اس دنیا میں کسی انسان کے ان ہی حالات کو دیکھ سکتے ہیں جن کا تعلق براہِ راست اس کے جسم سے ہو۔ (معارف الحدیث:۱/۱۸۹-۱۸۸)

## مُعجِزات اور کرامات

مُعجِزات اور کرامات حق ہیں۔ مُعجِزات مُعجِزہ کی جمع ہے، اس کے معنی لوگوں کو عاجز اور بے بس کرنے والی چیز کے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کے ہاتھوں پر کبھی کبھی ایسے غیر معمولی واقعات ظاہر ہوتے ہیں جو طبعی اسباب سے بالاتر ہوتے ہیں، اس لیے وہ لوگوں کو بے بس اور عاجز کر دیتے ہیں کہ ان کے مقابلہ اور جواب سے لوگ عاجز اور بے بس ہو جاتے ہیں اور ان جیسا دوسرا انسان ان کو کر کے نہیں دکھا سکتا۔ طبعی اسباب سے بالاتر ایسے غیر معمولی واقعات کو مُعجِزات کہا جاتا ہے۔

## مُعجِزات بھی ضروری ہیں

جو لوگ سلیم الفطرت اور سلیم العقل ہوتے ہیں ان کو پیغمبروں کے کسی مُعجِزہ کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی ان کے لیے پیغمبر کی عملی زندگی، ان کا کلام اور دلائل ہی مُعجِزے کا کام دیتے ہیں، لیکن انسانوں میں بعض لوگ اس قدر کم فہم بھی ہوتے ہیں جو کسی پیغمبر کی پیغمبری کے قائل تب ہوتے ہیں جب اس کے ہاتھوں غیر معمولی واقعات ظاہر ہوں تو اللہ

تعالیٰ ایسے کم فہموں کے لیے مُعجِزات بھی دیتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے انبیا علیہم السلام کی سچائی کے لیے بطورِ علامت قائم کرتے ہیں چونکہ یہ معجزات انبیا علیہم السلام کی صداقت کے مشاہدے میں آنے والے دلائل ہوتے ہیں اس لیے ان کو دلائلِ نبوت بھی کہتے ہیں۔

## مُعجِزات اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں ہوتے

مُعجِزات چونکہ طبعی اسباب سے بالاتر ہوتے ہیں، اس لیے یہ انبیا علیہم السلام کی ذاتی محنت اور تصرُّف سے ظاہر نہیں ہوتے، بلکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق کے قبضۂ قدرت میں ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جب چاہتے ہیں ان کو اپنے انبیا علیہم السلام کے ہاتھوں ظاہر کرتے ہیں، پیغمبر کے عمل و کسب کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ

"کسی نبی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی مُعجِزہ پیش کرے۔"

(سورۂ رعد:۳۸)

نیز ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ:

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ

"ان سے کہدیجیے (کہ جو نشانیاں اور مُعجِزے تم چاہتے ہو وہ) نشانیاں اور مُعجِزات تو اللہ تعالیٰ کے پاس (اور اسی کے قبضہ قدرت میں) ہیں۔" (انعام:۱۰۹)

مذکورہ بالا آیتوں کے علاوہ قرآن مجید میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ مُعجِزے کا اختیار کسی کو نہیں دیا گیا، بلکہ انبیا علیہم السلام کے ہاتھوں پر جو غیر معمولی واقعات ظاہر ہوئے ہیں مثلاً عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے طرح طرح کے مُعجزات کا ظہور اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسی مُعجزات یہ سب کے سب صرف اسی وقت ظہور پذیر ہوتے تھے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوتا تھا، ان مُعجِزات کے ظاہر کرنے میں نہ تو ان کے کسی تصرف اور کسب کا دخل تھا اور نہ ان کو یہ اختیار حاصل تھا مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ اختیار نہیں دیا گیا تھا کہ آپ جب چاہیں اور جس شخص کے متعلق چاہیں اس کو زندہ کر دیں، بلکہ ان کے ہاتھوں صرف وہی زندہ ہوتا جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ فرماتے۔ یہی حال عصائے موسیٰ علیہ السلام کا ہے، یہی حال تمام مُعجِزات اور کرامات کا ہے۔

## مُعجِزے کا توڑ اور جواب لانا ناممکن کیوں؟

خلاصہ یہ کہ مُعجِزہ یا کرامت کو اللہ تعالیٰ نے کسب وہنر سے متعلق نہیں کیا ہے اور نہ یہ ایک فنی یا کسبی چیز ہے، بلکہ یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کے حکم و فعل سے وجود میں آتا ہے اس لیے اس کا توڑ اور جواب لانا ناممکن ہے، اس کی مثال سورج چاند اور ستارے وغیرہ کی طرح ہے یا یوں کہیے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ پیدا کرتے ہیں ان کی طرح ہے کہ انسان کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ چاند سورج کو بنائے اور نہ اس کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ مادہ کو پیدا کرے، اسی طرح نہ وہ گندم کو بنا سکتا ہے اور نہ ریت کے ذرے کو، وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزیں لوہا وغیرہ سے جہاز بنا کر ہوا میں اُڑا تو سکتا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی مکھی کی ایک ٹانگ نہیں بنا سکتا۔

## مُعجِزہ اور جادو میں فرق

(۱) جادو ایک فنی چیز ہے جو کسب و عمل سے حاصل ہوتا ہے، اس کے باقاعدہ اصول وضوابط، الفاظ کا ہیر پھیر اور تعداد وغیرہ ہیں اس لیے دوسرے مادی فنون کی طرح جادو کا

توڑ دوسرے انسان بھی لاسکتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے سے بڑھ بھی سکتے ہیں۔

(۲) جادو اور ہپناٹزم وغیرہ جیسی فنی چیزوں کے اسباب اور قواعد اگرچہ عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں مگر اہل فن کو معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ سائنسی ایجادات عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں مگر سائنسدان ان کے اسباب کو خوب جانتے ہیں اس لیے سائنسی ایجادات کو وہ قدرتی چیز نہیں، بلکہ مصنوعی چیزیں مانتے ہیں اس لیے ان کا وہ توڑ اور جواب بھی لاسکتے ہیں۔

(۳) جادو فریبِ نظر و خیال ہوتا ہے جبکہ مُعجِزہ ایک عظیم حقیقت ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب بھی جادو اور مُعجِزہ کا مقابلہ ہوتا ہے تو جادو کا فریب اور اس کا بھرم کھل جاتا ہے اور جادوگر دُم دبا کر بھاگ جاتا ہے جس کی مثال عصائے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کے مقابلے کا نتیجہ واضح طور پر قرآن مجید میں موجود ہے۔

(۴) اس لیے جادو اور مُعجِزہ جب دونوں ایک ہی میدان میں آمنے سامنے آجاتے ہیں تو دونوں کے درمیان اس قدر واضح فرق ہو جاتا ہے کہ اس کو ہر خاص و عام محسوس کرتا ہے جیسا کہ مصنوعی پھول کے پاس جب قدرتی پھول رکھا جاتا ہے تو ہر کوئی جان لیتا ہے کہ یہ قدرتی پھول ہے اور یہ مصنوعی۔ اس کی پوری تفصیل جان لینا چاہتے ہو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے لائے ہوئے جادوگروں کے واقعہ کو پڑھ لیجیے۔

(۵) مُعجِزہ اور کرامت جس سے صادر ہوتے ہیں ان کا تقویٰ، صداقت، امانت، طہارت، پاکیزگی، اخلاق و مروت اور اعمال ایسے بلند ہوتے ہیں جن کا سب لوگ مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کی اخلاقی بلندی اور نیک سیرت و کردار کے معترف ہوتے ہیں، ان کا کلام اور تعلیم لوگوں کے لیے ہدایت کی روشنی ہوتی ہے اور ان کی ہدایات کو جو لوگ اپناتے ہیں

ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اصلاح ہوتی ہے،وہ امانت،صداقت وغیرہ جیسے بلند اخلاق کے پیکر ہوتے ہیں۔اس کے برعکس جادو اور فن جن لوگوں کے ہاتھوں سے ظاہر ہوتا ہے وہ ہرگز حق کے داعی نہیں ہوتے،بلکہ ان کے اندر دنیا کی حرص ولالچ ہوتی ہے، ان کے صحبت یافتہ حرص ولالچ اور دنیاوی مفادات کی گندگیوں سے آلودہ ہوتے ہیں اور خود ان کی اپنی ذاتی حیثیت بھی شعبدہ باز کی ہوتی ہے وہ صرف لوگوں کو کھیل دکھاتے ہیں، ان کا کردار وسیرت داغدار،بلکہ ناپاک ہوتی ہے۔

(۶) جادوگر جھوٹ اور سچ کا مجموعہ ہوتا ہے،اس کی پیشگوئیاں جھوٹی ہوتی ہیں۔اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی پیشگوئیاں سراسر سچ اور حق پر مبنی ہوتی ہیں۔جادوگروں کی اکثر باتیں غلط اور بے ہودہ ہوتی ہیں جبکہ انبیا علیہم السلام کی ہر بات حق پر مبنی اور ہو کر رہتی ہے۔

## کرامات

اللہ تعالیٰ کبھی کبھی انبیا علیہم السلام کے علاوہ اپنے اور نیک بندوں سے ایسے واقعات ظاہر فرماتے ہیں جو طبعی اسباب سے بالاتر ہوتے ہیں جو ان کی مقبولیت کی نشانی اور علامت ہوا کرتے ہیں۔اصطلاح میں ایسے واقعات کو کرامات کہا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ جب طبعی اسباب سے بالاتر کوئی چیز انبیا علیہم السلام سے ظاہر ہوتی ہے تو اس کو مُعجِزہ کہتے ہیں اور اس طرح کی چیز جب انبیا علیہم السلام کے علاوہ کسی نیک بندے سے ظاہر ہو تو اس کو کرامت کہتے ہیں۔یہ کرامت اس سے ظاہر ہو سکتی ہے جو اپنے وقت کے نبی کا سچا تابعدار اور ان کی سچی اتباع کرنے والا ہو اور جو شخص فاسق فاجر ہو یا سنتِ نبی علی صاحبها الصلوٰة والسلام کے خلاف زندگی گذارتا ہو اگر اس سے کوئی ایسا کام صادر ہو جائے تو وہ اس کی قوت نفسیہ جادو یا ریاضتِ نفس کا کوئی عجوبہ ہوگا جس کو "استدراج" کہا جاتا ہے۔

## نبی کریم ﷺ کا علمی اور دائمی مُعجِزہ قرآن مجید ہے

پچھلے انبیا علیہم السلام کو عموماً وہ مُعجِزے دیے گئے جو عمل اور مشاہدہ یعنی نظر آنے والے تھے جیسے موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور یدِ بیضا وغیرہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیدائشی اندھوں اور کوڑھیوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے تندرست کرنا یا اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ، عملی ومشاہداتی مُعجِزات ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا اثر وقتی اور عارضی ہوتا ہے، ان سے صرف وہی لوگ متاثر ہوتے ہیں جو اس مُعجِزہ کا مشاہدہ کرتے ہیں، جب صاحبِ مُعجِزہ دنیا سے تشریف لے جاتے ہیں تو وہ مُعجِزہ لوگوں کے سامنے باقی نہیں رہتا صرف اس مُعجِزہ کی حکایت باقی رہ جاتی ہے۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کی نبوت دائمی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جہاں ایک طرف بہت سے عملی اور مشاہداتی مُعجِزات دیے ہیں جن کی وجہ سے عہد رسالت میں مسلمانوں کا ایمان ویقین اور زیادہ پختہ اور غیر متزلزل ہو گیا تھا اور کفار ومشرکین کے لیے ان کی آنکھوں سے تعصّب وغیرہ کی پٹیاں اتارنے اور ان پر ہر طرح سے حُجّت پوری کرنے کا ذریعہ بن گئے، وہاں دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رہتی دنیا تک کے تمام انسانوں اور جنات کے لیے ایک علمی کلام (قرآن مجید) عطا فرمایا جو لاکھوں عملی مُعجِزوں سے بڑھ کر ہے اور جس کی نظیر پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے اب بھی اور قیامت تک کے ہر زمانہ کے تمام لوگوں کو چیلنج دیا جارہا ہے کہ اس دائمی مُعجِزہ یعنی قرآن کے مقابلہ میں پورا قرآن مجید ہی نہیں، صرف ایک چھوٹی سی سورت پیش کرو، لیکن پھر بھی پوری دنیا کے انسان اور جنات اول تا آخر تمام دنیا کی پوری مخلوق مل کر بھی اس کی مثال لانے سے قاصر عاجز اور بے بس ہے۔ [1]

---

(1) پوری تفصیل کے لیے "دہریت سے اسلام تک" کو پڑھ لیجیے۔

## کرامات ومُعجزات کے منکر کون لوگ ہیں؟

جولوگ مُعجِزات اور کرامات کے منکر ہیں وہ کئی قسم کے ہیں۔ یہاں ان اقسام کو مختصراً نقل کرتا ہوں:

(۱) ان میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر ہیں، ان مادہ پرستوں کی جہالت اور حماقت تو اس قدر واضح ہے کہ خود ان کا وجود اور ان کے گردوپیش کی ایک ایک چیز ان کی جہالت وحماقت کی شہادت دے رہی ہے۔

(۲) بعض لوگ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو مانتے ہیں، لیکن ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو ایک خاص نظم وقانون پر چلا دیا ہے، اس کے بعد کائنات کے نظم ونسق میں اس کا کوئی تصرُّف نہ رہا گویا وہ الگ تھلگ بیٹھ کر ایک بے بس تماشائی کی طرح خاموشی سے دیکھ رہا ہے اور اس کے سوا وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ دراصل اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی صفاتِ کمال کے منکر ہیں، ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کو ایک بے اختیار اور بے قدرت ہستی مانتے ہیں۔

(۳) ان منکرین میں بعض نام نہاد مسلمان بھی ہیں جن کے دل ودماغ پر مادہ پرستی، مادی ترقی اور سائنسی برتری کا بت سوار ہے، وہ بھی قطعی ویقینی طور پر ثابت شدہ مُعجِزات کو کسی نہ کسی طرح ایسے واقعات بنانے کی کوشش کرتے ہیں جن کا وقوع اسبابِ طبعیہ کے تحت ممکن ہو اور وہ اس نامبارک کوشش میں قرآن مجید کی معنوی تحریف کر کے زندقہ اور گمراہی کے شکار ہوتے ہیں۔

(۴) بعض سادہ لوح ایسے بھی ہیں جو یقینی مُعجِزات اور کرامات میں باطل تاویل کی راہ اس لیے اختیار کرتے ہیں تاکہ روشن خیال (بددماغ) اور مستشرقین کو اسلام اور قرآن مجید

کے متعلق مطمئن کر سکیں، لیکن یہ لوگ بھی قرآن اور اسلام کے ایسے ناداں دوست ہیں کہ ان کی یہ دوستی خود مسلمانوں کی عوام کے لیے سخت خطرناک اور گمراہی کا سبب بنتی ہے۔

## قرآن مجید اور اسلام کیوں معجزات کے قائل ہیں

قرآن مجید اور اسلام اس لیے مُعجِزات و کرامات کی تعلیم دیتا ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے، اور وہ اس حقیقت کو پُرزور انداز میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق اور بااختیار ہستی ہے، تمام چیزیں اسی کی بنائی ہوئی ہیں اسباب خواہ وہ مادی اور طبعی ہوں یا غیر طبعی سب پر اسی کی حکومت واقتدار چلتا ہے، تمام اسباب اور تمام چیزیں اسی کی بنائی ہوئی ہیں، وہ اپنی پیدائش اور نفع وضرر رسانی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی محتاج ہیں اس لیے ایک مسلمان اس حقیقت کو خوب جانتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہو رہا ہے۔

آخر طبعی اسباب سوائے اس کے کیا ہے کہ ہم نے بار بار اسباب سے چیزوں کا پیدا ہونا دیکھا ہے، ورنہ طبعی اسباب کے ماتحت چیزوں کا پیدا ہونا اسی طرح مُعجِزہ ہے جیسا کہ غیر طبعی اسباب سے ان کا ظہور وصدور مثلاً اللہ تعالیٰ سانپ، بچھو، درندوں اور پرندوں وغیرہ تمام مادی چیزوں کو ایک ہی جیسے بے جان مادّے سے بناتے ہیں، اب سانپ اور اس کے انڈوں کو بے جان مادہ سے بنانا اور پھر ان انڈوں سے سانپ کا پیدا ہونا اتنا ہی عجیب ہے جتنا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بے جان لاٹھی سے سانپ اور اژدھا کا بننا لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ انڈوں سے سانپ کا پیدا ہونا بار بار پیش آتا ہے اور لاٹھی سے سانپ کا بننا صرف چند بار۔

اس لیے پہلے واقعہ کے متعلق کوئی تعجب نہیں کیا جاتا اور دوسرا واقعہ لوگوں کو عجیب لگتا ہے حالانکہ عجیب ہونے اور مُعجِزہ ہونے کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں

دونوں برابر ہیں اس لیے جو چیزیں اللہ تعالیٰ عام عادت اور عام قدرت کے مطابق اسباب کے تحت پیدا فرماتے ہیں ان کو دلائلِ قدرت کہتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرت کی شہادت اور گواہی دے رہی ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی نبی کی سچائی اور صداقت ثابت کرنے کے لیے کسی چیز کو طبعی اسباب کے بغیر اپنی خاص عادت اور اپنی خاص قدرت کے مطابق دنیا کے سامنے ظاہر کرتے ہیں تو اسے دلائلِ نبوت یا مُعجِزہ کہتے ہیں۔

## اولیاء اللہ کا بیان

جو مسلمان اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے حکموں کی تابعداری کرے، کثرت سے عبادت کرے، گناہوں سے بچتا رہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت دنیا کی تمام چیزوں کی محبت سے زیادہ رکھے تو وہ اللہ تعالیٰ کا مُقرّب اور پیارا بن جاتا ہے ایسے مسلمان کو "ولی" کہتے ہیں، اس کی پہچان یہی ہے کہ مسلمان متقی پرہیز گار ہو کر کثرت سے عبادت کرتا ہو اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی محبت اس پر غالب ہو، دنیا کی حرص نہ ہو، آخرت کا خیال ہر وقت پیشِ نظر ہو۔

(۲) تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اولیاء اللہ تھے کوئی بھی ولی خواہ کتنا ہی بڑا درجہ رکھتا ہو وہ کسی صحابی کے مرتبہ کے برابر یا بڑھ کر نہیں ہو سکتا، اسی طرح کوئی بڑے سے بڑا صحابی اور کوئی ولی نبی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا ہے۔

(۳) جب تک آدمی اپنے ہوش و حواس میں ہو، اس کی طاقت واستطاعت درست ہو تو کوئی عبادت معاف نہیں اور نہ کوئی گناہ کی بات کسی شخص کے لیے جائز ہو سکتی ہے، جو لوگ خلاف شرع کام کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ ہمارے لیے جائز ہیں ایسے لوگ ہر گز ولی نہیں ہوسکتے، بلکہ بے دین اور گمراہ ہیں۔

(۴) اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی عزت بڑھانے کے لیے بھی کبھی کبھی ان کے ذریعے سے ایسی باتیں ظاہر کر دیتا ہے جو عادت کے خلاف اور مشکل ہوتی ہیں ان کو دوسرے لوگ نہیں کر سکتے، ان باتوں کو کرامات کہتے ہیں جس طرح مُعجِزہ نبی کا ذاتی اور اختیاری فعل نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، اسی طرح کرامت بھی ولی کا فعل نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی فعل ہوا کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارادے اور اختیار سے اس مقبول بندہ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گذر چکا۔ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ ولی سے کوئی کرامت ظاہر ہو، ممکن ہے کسی شخص کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت زیادہ تعلق ہو وہ بہت بڑا ولی ہو اور عمر بھر اس سے کوئی کرامت ظاہر نہ ہوئی ہو۔

## سنی اور اہل السنۃ والجماعۃ کا مطلب

سنی کا لفظ اہل السنۃ والجماعۃ کو مختصر کر کے بنایا گیا ہے تا کہ نام لینے میں آسانی ہو، اہل سنت والجماعت سے کون مراد ہیں؟ اس کی ضروری تفصیل یہ ہے:

یہ جماعت تین لفظوں پر مشتمل ہے، ان لفظوں کے معنی اور تشریح سے خود بخود اہل سنت والجماعت کی شکل وصورت اور خدوخال واضح ہو جائیں گے۔

اھل کے معنی ہیں "لائق" یہ لفظ ان لوگوں اور اس گروہ کے لیے بولا جاتا ہے جو آپس میں نسب یا دین یا فن وپیشہ یا قوم وملت وغیرہ میں مشترک ہوں جیسے اہلِ مکہ، اہلِ کتاب، اہلِ تقویٰ، اہلِ علم، اہلِ خانہ وغیرہ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سنت اور جماعت کے ماننے والے یا سنت اور جماعت کے پیروکار۔

سنت کے معنی دستور، راستہ اور طریقہ کے ہیں۔

اس سے وہ طریقہ اور دستورِ زندگی مراد ہے جس کو نبی کریم ﷺ نے اختیار کیا ہے اور اس پر اپنی زندگی گذاری ہے۔

## نبی کریم ﷺ کا دستورِ زندگی اور طریقہ کیا ہے؟

نبی کریم ﷺ کا دستورِ زندگی اور طریقہ قرآن مجید اور حدیث دونوں کا مجموعہ ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، اس میں زندگی گذارنے کے اصول اور قوانین ہیں اور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں، وہی قرآن مجید کے اصول و قوانین اور اس کے احکامات و ہدایات کو اپنے قول اور عمل سے سمجھانے اور بتلانے والے ہیں، آپ ﷺ کے اقوال، اعمال اور اخلاق و عادات قرآن مجید کی چلتی پھرتی تفسیر اور عملی نمونہ ہیں اور نبی کریم ﷺ نے قرآن مجید کے مطابق جس طرح عمل کر کے دکھایا ہے اور اس کے عقائد، احکامات اور ہدایات کو جن ارشادات کے ذریعے واضح کیا ہے آپ ﷺ کی اس تمام عملی زندگی اور آپ ﷺ کے تمام ارشادات کو خاص اصطلاح میں ”حدیث و سنت“ کہا جاتا ہے، یہ سب کچھ حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے۔

## والجماعت کا مطلب

(۳) اہل السنۃ والجماعت میں تیسرا لفظ والجماعت کا ہے اس سے مراد اصحابِ رسول ﷺ کی جماعت ہیں، یہ وہ جماعت ہے جس نے براہِ راست نبی کریم ﷺ سے فیض حاصل کیا، ان کی زندگی قرآن و سنت کے رنگ میں پوری طرح رنگی ہوئی تھی ظاہر ہے کہ قرآن و سنت کا جو منشا انہوں نے سمجھا ہے اور جن امور پر اس جماعت کا اجماع و اتفاق ہے وہی قابلِ قبول اور واجب الاتباع ہوں گے۔

## اہل سنت والجماعت

اہل سنت والجماعت مسلمانوں کی ایسی جماعت اور ایسا گروہ ہے جو قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ کو حسن وخوبی کے ساتھ اپنانے والا اور اپنی مرضی وہوائے نفس کے بجائے اللہ تعالیٰ کی مرضی کی بندگی کرنے والے ہیں۔

(۱) یہ لوگ قرآن مجید کو دینِ اسلام کا اصل اور اساس مانتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ رسول ﷺ کے طرزِ عمل اور آپ ﷺ کے ارشادات کو قرآن مجید کی شرح اور تفصیل سمجھتے ہیں اور جن چیزوں کا بیان قرآن مجید میں بظاہر موجود نہیں اور حدیث وسنت رسول ﷺ میں ان کا حکم اور بیان موجود ہے ان کے نزدیک وہ بھی واجب الاتباع ہے۔

(۲) وہ قرآن مجید اور سنتِ رسول ﷺ کی یہ حیثیت تسلیم کرنے کے ساتھ جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ حیثیت بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن مجید اور سنت رسول علی صاحبها الصلوٰۃ والسلام کا جو منشا انہوں نے سمجھا اور جن امور پر اس پاکیزہ جماعت کا اتفاق اور اجماع ہوگیا (جیسا کہ بیس تراویح وغیرہ) وہ بھی واجب الاتباع ہے، کسی مسلمان کو حق نہیں ہے کہ ان کے اجتماعی مسلک اور اجماعی فیصلوں کے خلاف اپنی کوئی رائے قائم کرے۔ دینِ اسلام کی کسی حقیقت وعقیدہ اور کسی مسئلہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اتفاق و اجماع کے معنی اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہ ہیں کہ یہ مسئلہ اور عقیدہ قطعی ہے اور اس سے اختلاف کرنا ضلالت وگمراہی ہے۔

## اہل سنت والجماعت کا مختصر مطلب

اہل السنت والجماعت کا مختصر اور آسان مطلب یہ ہوا کہ یہ وہ جماعت یا وہ لوگ ہیں جو قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع کو بھی لازم قرار دیتے ہیں۔

## اصطلاح "اہل سنت والجماعت" کا ماخذ

"اہل سنت والجماعت" کے الگ الگ معنی سمجھ لینے کے بعد اب اس اصطلاح کا ماخذ بھی سمجھ لیجیے:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سابقہ امتوں میں بہتّر (۷۲) فرقے تھے اور میری امت میں تہتّر (۷۳) فرقے ہوں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا کہ اللہ کے نبی کون سا فرقہ حق پر ہو گا؟ تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: مَاأَنَا عَلَیْهِ وَأَصْحَابِیْ "جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ۔"

"جس پر میں ہوں" یعنی نبی کریم ﷺ کی سنت "اور میرے اصحاب" یعنی جماعتِ نبی کریم ﷺ کا راستہ، پس جو بھی نبی ﷺ کے طریقہ پر اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے راستہ پر چلے گا وہ ہی اس سے مراد ہو گا، نبی کریم ﷺ کا راستہ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم کا راستہ اختیار کرنے والوں کو اہل سنت والجماعت کہتے ہیں۔ یعنی تمام فرقوں میں نجات پانے والا فرقہ صرف اہلِ سنت والجماعت ہو گا۔

## اہل السنۃ والجماعۃ اور قرآن مجید

نبی کریم ﷺ کے طرزِ زندگی اور ان کے ارشادات کی اتباع اور پیروی اختیار کرنے پر قرآن مجید نے بہت زور دیا ہے، کیونکہ انبیائے کرام علیہم السلام کی مبارک زندگیاں ہی اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے نمونے ہوتی ہیں، یہاں بطورِ نمونہ صرف چند آیتوں کو پیش کیا جاتا ہے:

اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ

"اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو۔"

(آل عمران:۳۲)

اطاعت کے متعلق دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

”اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس واسطے کہ اس کے حکم پر چلا جائے اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔“ (النساء:۶۴)

مطلب یہ ہے کہ رسول اس لیے بھیجا جاتا ہے تاکہ لوگ اس سے اپنی زندگی کا دستور اور طریقہ معلوم کریں اور اس پر مضبوطی سے عملاً کاربند ہوں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

”جس نے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔“ (النساء:۸۰)

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی تاکید ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

”(اے پیغمبر ان سے) کہہ دیجیے اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔“ (آل عمران:۳۱)

ایک دوسری جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستور اور طریقہ زندگی کے اپنانے پر زور دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ
يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾

”تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے رسول (کے طرزِ زندگی) میں بہترین نمونہ تھا اس شخص کے

لیے جو اللہ تعالیٰ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرے۔"

(احزاب:۲۱)

اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ راہِ حق اور نبی کریم ﷺ کے طریقۂ زندگی میں عزیمت واستقامت ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن کا اللہ تعالیٰ اور آخرت پر مضبوط ایمان ہو اور وہ برابر اپنے ایمان کو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد سے تازہ رکھیں۔

بلاشبہ نبی کریم ﷺ کا طریقہ اور آپ ﷺ کا طرزِ زندگی قیامت تک اہلِ ایمان کے لیے خدا پرستانہ زندگی کا نمونہ ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن وسنت کے مطابق زندگی گذارنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

## صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع کی ضرورت

عقل، مشاہدہ اور تجربہ سے یہ بات ثابت ہے کہ عملی اور فنی چیزیں ماہرینِ عمل وفن سے سیکھی جاتی ہیں، کوئی شخص محض کتابوں کے دیکھنے سے ڈاکٹر، انجنیئر، ڈرائیور وغیرہ نہیں بن سکتا۔ دینِ اسلام یعنی ایمان، ذکر وعبادات، اخلاقیات اور حقوق العباد وغیرہ کی ادائیگی سراسر عملی چیز ہے، اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ دینِ اسلام ان شخصیات سے سیکھا جائے جن کی زندگیاں دینِ اسلام میں ڈھلی ہوئی ہوں اور انہوں نے دینِ اسلام کا عملی نمونہ نبی کریم ﷺ سے سیکھا اور سمجھا ہو اور ان ماہرین کی پہلی جماعت اصحاب رسول ﷺ ہیں جنھوں نے براہِ راست نبی کریم ﷺ سے دینِ اسلام کو قولاً اور عملاً سیکھا ہے اور اپنے قول وعمل سے پورے دینِ اسلام کو دوسروں تک پہنچایا ہے۔

## تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ کون لوگ ہیں؟

جن لوگوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع کی یا ان سے دین کے علم اور عمل کو حاصل

کیا ان لوگوں کو تابعین کہتے ہیں۔ تابعین، تابعی کی جمع ہے اور جن لوگوں نے دین کے اس علم اور عمل کو تابعین سے سیکھا اور حاصل کیا ان کو تبع تابعین کہتے ہیں، یہی سلسلہ اول سے لے کر آج تک چلا آرہا ہے، دینِ اسلام کو عملی اور علمی طور پر سیکھنے کی یہی ایک پاکیزہ راہ ہو سکتی تھی، اس لیے یہی وہ سلسلہ ہے جس کو مضبوطی سے پکڑنے پر قرآن مجید اور سنت نے بہت زور دیا ہے۔

## صراطِ مستقیم اور جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

قرآن مجید کی پہلی سورت سورۂ فاتحہ میں ہے :

اِهدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِيمَ ﴿٥﴾ صِرَاطَ الَّذِينَ اَنعَمتَ عَلَيهِم ۵

”ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت بخش ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔“ (سورۂ فاتحہ:٦-٥)

اس میں دو جملے ہیں ایک ”صراطِ مستقیم“ اس سے مراد وہ سیدھا راستہ ہے جو بندوں کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے کھولا ہے اور جو دین ودنیا دونوں کی فلاح و نجات کا ضامن ہے جس پر چلنے کی دعوت نبیوں اور رسولوں نے دی ہے جس پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے چلے آرہے ہیں، وہ راستہ دینِ اسلام ہے جس کے کامل اور مکمل اصول و قواعد قرآن مجید میں اور عملی و علمی تشریح نبی کریم ﷺ کے طرزِ عمل اور آپ ﷺ کے ارشادات میں موجود ہے۔

لہٰذا نبی کریم ﷺ کی بعثت سے لے کر قیامت تک کے تمام لوگوں کے لیے ”صراطِ مستقیم“ قرآن مجید کی عملی اور علمی راہ ہے

صِرَاطَ الَّذِينَ اَنعَمتَ عَلَيهِم

”ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے“

اس جملے میں ان لوگوں کا بیان ہے جن سے یہ راستہ علمی اور عملی طور پر معلوم کیا جاسکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ انبیا علیہم السلام اور آخری نبی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی مقبول اور انعام یافتہ جو جماعت ہو سکتی ہے وہ وہی ہو گی جس نے براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے علم اور عمل کو سیکھا ہے، اس انعام یافتہ گروہ کی تحسین اللہ تعالیٰ نے خود ان الفاظ میں فرمائی ہے:

وَ مَن يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُولَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِينَ اَنعَمَ اللّٰهُ عَلَيهِم مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيقِينَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِينَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيقًا ﴿٦٩﴾

"اور جو اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیا علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین لوگ کیسی ہی اچھی ان کی رفاقت ہے۔" (النساء:٦٩)

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلے دل و جان سے اتباع کرنے والے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو دیکھ کر براہِ راست اتباع کرنے والے لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہی پہلی انعام یافتہ جماعت ہے جو بحیثیت جماعت ہمارے لیے صراطِ مستقیم کا عملی نمونہ بن سکتی ہے۔

## قرآن مجید کی رو سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستے اور مسلک کی اہمیت و حیثیت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عقیدے اور جس مسئلے اور مسلک پر ان کا اجماع ہو چکا ہو اس کی اہمیت اور حیثیت کے بارے میں قرآن مجید میں سے کچھ پڑھ لیجیے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِن اٰمَنُوا بِمِثلِ مَآ اٰمَنتُم بِهٖ فَقَدِ اهتَدَوا ۚ

وَ اِن تَوَلَّوا فَاِنَّمَا هُم فِي شِقَاقٍ

"پس اگر وہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح سے تم (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) ایمان لائے ہو تب تو وہ بھی ہدایت یاب ہوئے اور اگر وہ روگردانی کرے تو پھر بس وہ درپے مخالفت ہیں۔" (سورۃ البقرہ:۱۳۷)

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جس عقیدے اور جس مسئلے پر اتفاق واجماع ہو وہی صحیح ایمان اور صحیح مسلک ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہی ایمان معتبر ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کی طرح ہو، جن چیزوں میں جس کیفیت کے ساتھ ان کا ایمان ہے اسی طرح ایمان دوسروں کا ہوگا تو اسے ایمان کہا جائے گا ورنہ نہیں، نیز اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

وَ مَن يُّشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنۢ بَعدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الهُدٰى وَ يَتَّبِع غَيرَ سَبِيلِ المُؤمِنِينَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَت مَصِيرًا ﴿۱۱۵﴾

"اور جو کوئی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کرے گا اور (سارے) مؤمنوں کے سوا کسی اور راستہ پر چلے گا تو ہم اس کو اسی راہ پر چلنے دیں گے جدھر وہ خود پھر گیا ہے اور (انجام کار قیامت کے دن) ہم اس کو جہنم میں ڈالیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے" (النساء:۱۱۵)

اس آیتِ کریمہ میں الرّسول سے سیدنا ومولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں اور ظاہر ہے کہ مؤمنین کے اوّلین مصداق اور مؤمنوں کی سب سے پہلی جماعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، سبیل کے معنی راستے اور مسلک وطریقے کے ہیں۔ اس آیت سے بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے زندگی کا جو مسلک اور طریقہ

اختیار کیا تھا وہ سراسر ہدایتِ الٰہی پر مبنی تھا اور وہی لوگ قرآن وسنت کے منشا کو خوب جاننے والے تھے اور اسی جماعت والے نبی کریم ﷺ کے براہِ راست شاگرد تھے، اس لیے نبی کریم ﷺ کی اتباع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع ہی میں منحصر ہے، اسی وجہ سے جن عقائد اور جن مسائل پر ان کا اتفاق واجماع ہوا ہے ان تمام عقائد واعمال اور مسائل میں ان کی اتباع ہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع ہے، ان کے اجماعی مسلک سے ہٹ کر کوئی راہ نکالنا سراسر گمراہی ہے جس کا انجام ذلت ورسوائی اور جہنم ہے۔

## صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع حدیث کی رو سے

قرآن مجید کی چند آیتوں کے بعد اب بطورِ نمونہ نبی کریم ﷺ کی احادیث کو پیش کرتے ہیں ان کو پڑھ لیجیے:

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت تہتّر فرقوں میں بٹ جائے گی ایک جماعت کے سوا سب جہنم میں جائیں گے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! وہ کونسی جماعت ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي

"جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔" (ترمذی مشکوۃ)

مطلب یہ ہے کہ نجات پانے والی وہ جماعت ہوگی جو اس راستے کی پیروکار ہو جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔

نبی کریم ﷺ جس راستے پر ہیں یہ وہی قرآن مجید ہے جس کی تشریح وتفصیل نبی کریم ﷺ نے اپنے قول اور عمل سے کی ہے، لہٰذا مَا أَنَا عَلَيْهِ "جس راہ پر میں ہوں۔"

سے مراد قرآن وسنت ہے، اس نجات یافتہ جماعت کی دوسری صفت یہ ہے کہ وَ أَصْحَابِي ”جس راہ پر میرے صحابہ ہیں۔“

جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ کا راستہ و طریقہ، اس کی تفصیل وتشریح اور اس کے خدوخال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قول و عمل کے ذریعے دنیا کے سامنے آئیں گے۔

اور یہی اہل سنت والجماعت کا منشور و دستور ہے کہ وہ قرآن وسنت کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کی اس حیثیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے درمیان جو مسائل اور عقائد متفقہ ہیں جن پر ان کا اجماع ہوا ہے ان کا اتباع بھی لازم ہے جیسا کہ اس کا ضروری بیان پہلے گذر چکا ہے۔

## تمام انبیا علیہم السلام خصوصاً نبی کریم ﷺ کی محبت اور ان کا ادب واحترام شرطِ ایمان ہے

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا لازمی نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت کا ہونا ہے:

والّذین اٰمنوا اَشدّ حُبًا لِلّٰہ ”اور جو ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت رکھتے ہیں“ جیسا کہ اس کا بیان اللہ تعالیٰ پر ایمان کی علامات اور نتائج میں گذر چکا ہے۔

اب نبی کریم ﷺ کی محبت اور عظمت کا شرط ایمان ہونے کے دلائل پڑھ لیجیے:

## محبت اور عظمتِ رسول ﷺ کے عقلی دلائل

(۱) یہ تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ محبوب کا محبوب محبوب ہوتا ہے اور محبوب کا مبغوض، مبغوض ہوتا ہے۔ اس قاعدے کی رو سے بھی نبی کریم ﷺ کے ساتھ ساری مخلوق

سے بڑھ کر محبت ہونی چاہیے۔

(۲) جس کتاب اور دین و دستور پر کامیابی کا دارومدار ہوتا ہے اس سے شدید محبت ہوا کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ دین اور دستور جن ذرائع سے پہنچا ہو ان سے بھی شدید محبت ہو گی، ان ذرائع میں سب سے زیادہ معزّز اور مکرّم سیدنا نبی کریم ﷺ ہیں۔

(۳) جو شخص جس قدر معزّز اور محترم استاد سے جس قدر اہم اور عظمت والا علم سیکھنے اور سمجھنے والا ہوتا ہے ان کے شاگرد بھی اسی قدر اس کی تعظیم اور احترام کرتے ہیں اور اسی قدر وہ اس سے محبت رکھتے ہیں تو جس شخصیت کا استاد اور سکھانے والا خود اللہ رب العالمین ہو اور علم بھی وہ جس پر ابدی فلاح، دنیا و آخرت کی عزت و اطمینان، سکون و فلاح اور نجات کا دارومدار ہو تو ایسی شخصیت کی عزت و احترام اور اس سے محبت بھی ساری مخلوقاتِ الٰہی سے بڑھ کر ہونا لازم اور عقل کا تقاضا ہے۔

یہاں ایک نکتہ یہ بھی یاد رکھیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس عظیم، محترم اور محبوب ترین شخصیت کے بلاواسطہ شاگرد ہیں اور باقی امت کے لیے یہی جماعت استاد کی حیثیت رکھتی ہے تو اس جماعت سے شدید محبت اور اس کا ادب و احترام بھی عقل کا تقاضا ہے۔

(۴) جو شخص جس قدر بڑی ہستی اور شان و شوکت والی ہستی کا سفیر اور نمائندہ ہوتا ہے وہ اسی قدر معزّز اور مکرّم سمجھا جاتا ہے، اسی قدر اس کا احترام کیا جاتا ہے تو جو شخص اللہ تعالیٰ جیسی ذات (جو ساری کائنات اور سارے جہانوں دنیا و آخرت، جنت و دوزخ کا خالق و مالک ہے) کا پیغمبر اور نمائندہ ہو اس کی عظمت اور احترام کا کیا حال ہو گا۔

(۵) جو شخص جس قدر کسی کا خیر خواہ ہو وفادار لوگ اسی قدر اس سے محبت رکھتے ہیں اس کا احترام کرتے ہیں تو جو شخصیت اس قدر خیر خواہ ہو کہ اس قدر ہم خود اپنی ذات کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے تو ایسی شخصیت کے ساتھ محبت کا نہ ہونا بلاشبہ سخت بے وفائی ہے۔

(٦) جس شخص کے اندر اچھے اخلاق اور کمالات ہوں اس سے محبت ہونا فطری تقاضا ہے تو جس شخص کے اخلاق کے متعلق رب عظیم یہ فرمائے کہ آپ ﷺ کے اخلاق عظیم ہیں اس کے اخلاق اور کمالات کی کیا حد ہوگی اور جس کے بارے میں ارحم الراحمین ذات فرمائے کہ:

وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿١٠٧﴾

تواس کے رحم ومہربانی ،شفقت اور ظاہری وباطنی کمالات کا تصور کون کرسکتا ہے؟

(٧) جب یہ بات معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اتباع واطاعت فرض اور لازم ہے تو حقیقی اطاعت واتباع تب ہوگی جب نبی کریم ﷺ سے شدید محبت اور ادب واحترام کا جذبہ ہو،ورنہ دل وجان سے اتباع نہ ہوگی بلکہ صرف ظاہری اطاعت ہوگی اور یہ وہ ظاہری اطاعت ہے جس کا دوسرا نام نفاق ہے۔

## محبتِ رسول ﷺ اور عظمتِ رسول ﷺ کے نقلی دلائل

محبتِ رسول ﷺ اور عظمتِ رسول ﷺ کے عقلی دلائل کے بعد اب اس کے نقلی دلائل بطورِ نمونہ قرآن وحدیث سے اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں ان کو پڑھ لیجیے:

(١) قُلۡ اِنۡ كَانَ اٰبَآؤُكُمۡ وَ اَبۡنَآؤُكُمۡ وَ اِخۡوَانُكُمۡ وَ اَزۡوَاجُكُمۡ وَعَشِيۡرَتُكُمۡ وَاَمۡوَالُ ۨاقۡتَرَفۡتُمُوۡهَا وَتِجَارَةٌ تَخۡشَوۡنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرۡضَوۡنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَ جِهَادٍ فِىۡ سَبِيۡلِهٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰى يَاۡتِىَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿٢٤﴾

"آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ چلتی ہوئی تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن (میں رہنے) کو تم پسند کرتے ہو یہ سب تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (عذاب) بھیج دے اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

(توبہ:۲۴)

اس آیتِ کریمہ میں فلاح ونجات کے لیے یہ شرط رکھی گئی ہے کہ دنیا کے تمام لوگوں اور دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی راہ میں جہاد سے ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس درجے کی محبت نہیں کہ ان کے حکم کے مقابلے میں ان تمام چیزوں کی قربانی پیش نہیں کر سکتے تو ایسا کمزور ایمان اور کمزور محبت انسان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔

فلاح ونجات کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دنیا کے ہر شخص اور ہر چیز سے زیادہ محبت ہو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں ہر چیز کو قربان بھی کر سکتا ہو۔

(۲) ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ونصرت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

"پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی عزت کی اور اس کی مدد کی اور اس

نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔
(اعراف:۱۵۷)

یہاں فلاح و نجات کو نبی کریم ﷺ اور قرآن مجید پر سچائی سے ایمان، آپ ﷺ کی سچی اتباع، آپ ﷺ کی عزت و ادب اور نصرت و مدد میں منحصر کر دیا ہے۔

(۳) نیز اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو نبی کریم ﷺ کی تکریم اور ادب کی ہدایت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَرفَعُوٓا اَصوَاتَكُم فَوقَ صَوتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجهَرُوا لَهٗ بِالقَولِ كَجَهرِ بَعضِكُم لِبَعضٍ اَن تَحبَطَ اَعمَالُكُم وَ اَنتُم لَا تَشعُرُونَ ۝

"اے ایمان والو تم اپنی آوازیں نبی (کریم ﷺ) کی آواز سے اونچی مت کرو اور نہ انہیں اس طرح آواز دے کر پکارو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔" (حجرات:۲)

اس آیت میں نبی کریم ﷺ سے متواضعانہ گفتگو اور آپ ﷺ کے ادب واحترام کا حکم ہے اور ذرا سی گستاخی پر بھی ایمان کے ضائع اور تمام اعمال کے برباد ہونے کی تنبیہ فرمائی گئی ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے، اس کی توہین یا بے ادبی اللہ تعالیٰ کی بے ادبی اور توہین ہے۔ خصوصاً وہ لوگ جن کا یہ ایمان ہو کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں پھر بھی آپ ﷺ کے حق میں ناشائستہ اور بے باکانہ زبان چلانا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا دل ایمان و تقویٰ سے خالی ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کو اپنے باپ اور اپنی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ میری محبت نہ ہو۔ (بخاری ومسلم)

## صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت اوران کا احترام

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وادب سے متعلق جو عقلی، نقلی دلائل بیان ہوئے ہیں، یہ سب دلائل ان لوگوں کے لیے بھی ہیں جن کے ذریعے ہم کو یہ عظیم دین پہنچا ہے جس پر ہماری فلاح ونجات کا دار ومدار ہے، البتہ ان دینی ذرائع میں سے ہر شخص کا ادب واحترام اس کے قُرب اور رتبے کے لحاظ سے ہو گا، اگر مراتب کالحاظ نہ ہوتو یہی انسان کی گمراہی کے لیے کافی ہے کیونکہ محبوبِ حقیقی اور معبودِ حقیقی صرف ایک اللہ تعالیٰ ہے، اس کی خاطر یہ ساری محبتیں، اُلفتیں اور ادب واحترام ہونالائق ہے، اس اعتبار سے عظیم دینی شخصیتوں کی محبت وادب اور ان کی اتباع میں فرق ہو گا، ہر دینی شخصیت کی اس کے قُرب ومرتبہ کے لحاظ سے تکریم واتباع ہو گی۔

لٰہذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ محبت واحترام اورادب کے لائق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے ان کی محبت وادب باقی تمام امت سے زیادہ ہو گی اور جن چیزوں پر ان کا اتفاق ہو چکا ہے ان میں ان کی اتباع امت کے باقی سارے طبقات پر مقدّم ہو گی۔

## صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت وادب اوراحترام سے متعلق نقلی دلائل

اس ضروری تمہید کے بعد اب چند ان نقلی دلائل کو صرف بطورِ نمونہ نقل کرتے ہیں جو براہِ راست جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ السّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِیۡنَ وَ الۡاَنۡصَارِ وَ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُمۡ بِاِحۡسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ وَ اَعَدَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ تَحۡتَهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۰۰﴾

”اور مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ (سب سے) سابق اور مقدم ہیں اور (بقیہ امت میں سے) جنہوں نے اخلاص اور حسن خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اس (اللہ تعالیٰ) سے راضی ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے یہی ہے بڑی کامیابی (جس کو یہ نصیب ہو)۔“ (توبہ:۱۰۰)

اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اسلامی معاشرے کا اصل سرمایہ ہیں، اس آیتِ کریمہ میں ان مہاجرین و انصار کی قدر و قیمت بتا کر بقیہ امت (خواہ بعد میں مسلمان ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں یا ان کے بعد آنے والے زمانوں کے لوگ ہوں ان سب) کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ ان کی اتباع اخلاص اور حسن وخوبی کے ساتھ کریں۔

اس آیتِ کریمہ نے ایک طرف عام مسلمانوں کے سامنے ان لوگوں کو پیش کر کے ان کی قدر و قیمت بتائی اور بتایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قربانیاں اور اعمال عام مسلمانوں کے لیے مثال اور نمونہ ہیں، دوسری طرف ان کی پیروی کی ترغیب دے دی اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے راضی ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں اور جو لوگ ان کی اتباع حسن وخوبی اور اخلاص کے ساتھ کرتے ہیں ان سے بھی اللہ تعالیٰ راضی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی۔

یہ آیتِ کریمہ اگر ایک طرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متفقہ اعمال و مسائل کی اتباع کولازم قرار دیتی ہے تو دوسری طرف یہ بتاتی ہے کہ یہ اتباع صرف ظاہری نہ ہو، بلکہ احسان یعنی کمالِ اخلاص اور کمالِ حسن وخوبی کے ساتھ ہو اور یہ بات ظاہر ہے کہ کمالِ اخلاص اور کمالِ حسن وخوبی سے اس شخص کی اتباع ہو سکتی ہے جس کے ساتھ والہانہ محبت اور والہانہ عقیدت بھی ہو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اسی قسم کی اتباع پر جنت کے وعدے ہیں۔

(۲) حضرت عبد اللہ بن معقل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِی اَصْحَابِی لَا تَتَّخِذُوْھُمْ غَرَضًا بَعْدِیْ فَمَنْ اَحَبَّھُمْ فَبِحُبِّی اَحَبَّھُمْ وَمَنْ اَبْغَضَھُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَھُمْ وَمَنْ اٰذَاھُمْ فَقَدْ اٰذَانِی وَمَنْ اٰذَانِی فَقَدْ اٰذَی اللّٰہَ وَمَنْ اٰذَی اللّٰہَ یُوْشَکُ اَنْ یَّاْخُذَھُمْ

”اللہ سے ڈرو اللہ سے ڈرو میرے اصحاب کے معاملے میں میرے بعد ان کو (طعن وتنقید کا) نشانہ نہ بناؤ کیونکہ جس نے ان سے محبت کی تو اس نے میرے ساتھ محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو اس نے میرے ساتھ بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا اور جس نے ان کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھ کو تکلیف پہنچائی اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ تعالیٰ کو تکلیف دی اور جو اللہ تعالیٰ کو تکلیف پہنچائے تو اللہ تعالیٰ عنقریب اس کو عذاب میں پکڑ لے گا۔“ (ترمذی و موارد الظمان ملخص صحیح ابن حبان:۵۶۹)

اس حدیث سے یہ چند باتیں ثابت ہوئیں:

ایک یہ کہ جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ہو وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ضرور محبت رکھے گا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت نہ رکھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت نہ ہونے کی علامت ہے کیونکہ محبوب کا محبوب، محبوب ہوا کرتا ہے۔

دوسری یہ کہ جو شخص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھتا ہے وہ دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو بغض وکینہ ہے اس کو وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر لعن طعن اور تنقید کی صورتوں میں ظاہر کر دیتا ہے۔

تیسری یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایذا اور تکلیف دینے سے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف اور ایذا پہنچتی ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے کے درپے ہو گا تو وہ اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کو چیلنج کرتا ہے۔

## (۳) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنے والے پر لعنت

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا رَاَیْتُمُ الَّذِیْنَ یَسُبُّوْنَ اَصْحَابِیْ فَقُوْلُوْا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی شَرِّکُمْ

"جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہتے ہیں تو ان سے کہو کہ تمہارے شر پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ (ترمذی)

اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ جس نے میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہا تو اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہو۔ (طبرانی)

اور ایک اور روایت میں ہے کہ میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں جو میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں جری (اور بے باک) ہیں۔ (طبرانی)

## صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنے والے کے اعمال قبول نہیں

(۴) حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کا وقت قریب آیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں وصیت کیجیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تمہیں سابقین اولین مہاجرین اور ان کے

بیٹوں کے بارے میں حسن سلوک (اور ادب واحترام) کی وصیت کرتا ہوں اگر تم ایسا نہ کروگے تو تمہارے فرائض ونوافل قبول نہ ہوں گے۔ (طبرانی بزار مجمع الزوائد)

یہاں صرف ایک آیت اور چند حدیثوں کو بطورِ نمونہ نقل کیا، ورنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ومناقب، ان سے محبت، ان کا احترام وادب، ان کی مخلصانہ اتباع اور ان کے فضائل ومناقب ان پر طعن وتشنیع کی وعیدوں پر اس قدر آیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات موجود ہیں کہ ان کے لیے ایک مستقل ضخیم کتاب درکار ہے اور علمائے اسلام نے ان کے فضائل ومناقب پر مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) فضائل الصحابہ رضی اللہ عنہم (عربی) للامام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (دو جلد)۔

(۲) فضائل الصحابہ رضی اللہ عنہم (اردو) مولانا حافظ مہر محمد صاحب۔

(۳) مناقب الصحابہ رضی اللہ عنہم (اردو) ڈاکٹر محمد اسماعیل میمن مدنی مدظلہ۔

(۴) مقام صحابہ (اردو) مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ۔

## صحابی کے معنی ومطلب

صحابی صحب سے نکلا ہے اس کے معنی قریب رہنے اور ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ لگ جانے کے ہیں اور اصطلاح میں صحابی اس شخص کو کہا جاتا ہے جس نے ایمان کی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی ہو اور ایمان ہی کی حالت میں اس کی وفات ہوئی ہو۔

## صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضلیت عام امت پر

مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ جس شخص کو ایمان واخلاص کی حالت میں عمر بھر

میں ایک بار بھی آپ ﷺ کے ساتھ ملاقات کا شرف حاصل ہو ا بعد میں آنے والا شخص خواہ کتنا ہی بڑا زاہد اور ولی اللہ کیوں نہ ہو وہ اس صحابی رضی اللہ عنہ کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔

یہ نگاہِ نبوت کی منوّر شعاعوں کا اثر ہے کہ جو بھی خالص دل کے ساتھ آپ ﷺ پر ایمان لایا اور آپ ﷺ کی صحبت میں ایک بار بیٹھا تو اس کے اندر ایمانی قوت اس قدر راسخ ہو گئی اور اس کا دل اس قدر صاف اور اخلاقِ حسنہ کا باغ بن گیا کہ عام امت اس کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِی فَلَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ
اُحُدٍ ذَھَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ اَحَدِھِم وَلَا نِصْفَهٗ

"میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ اگر کوئی تم میں سے احد پہاڑ کی مقدار سونا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ کسی صحابی کے ایک مُدّ یا آدھے مُدّ خرچ کرنے کے برابر نہیں ہو سکتا۔" (بخاری و مسلم)

اس حدیث نے واضح طور پر بتایا کہ سید الانبیا ﷺ کی حالتِ ایمان میں زیارت و صحبت وہ عظیم نعمت ہے جس کی بدولت کسی بھی صحابی کا عمل دوسرے لوگوں کے مقابلے میں وہ نسبت رکھتا ہے کہ دوسروں کا پہاڑ برابر سونا خرچ کرنے کا ثواب کسی صحابی کے ایک سیر سونا خرچ کرنے کے ثواب بلکہ آدھے سیر سونا خرچ کرنے کے ثواب تک نہیں پہنچ سکتا۔

## صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک دوسرے پر فضیلت

اگرچہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہر صحابی رضی اللہ عنہ شرفِ صحبت حاصل کرنے کی وجہ سے بعد میں آنے والے ہر مسلمان سے افضل ہے مگر خود ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے مثلاً انبیا علیہم السلام کے بعد سب سے بلند مقام بالترتیب نبی کریم ﷺ کے ان چار خلفاء کا ہے جو آپ ﷺ کے بعد مسلمانوں کے تمام دینی اور دنیاوی معاملات طے کرنے

کے لیے خلیفہ اور نائب مقرر ہوئے جن کے نام یہ ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اسی طرح ان کے بعد حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبد الرحمن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابو عبیدہ بن الجراح اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین (جو کہ عشرہ مبشَّرہ میں سے ہیں) امت کے افضل ترین لوگوں میں سے ہیں، نیز احادیث میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی امتیازی خصوصیات اور بڑی فضیلتیں آئی ہیں۔

## اہلِ بیت کا مطلب

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی قرابت دار اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہَّرات اور پاکیزہ اولاد ہیں ان سب کو اہلِ بیت کہا جاتا ہے، لیکن اہلِ بیت کے اولین مصداق ازواجِ مطہَّرات ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا

"اے نبی کے اہلِ بیت (گھر والو) اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور رکھے اور تمہیں ایسی پاکیزگی عطا کرے جو ہر طرح مکمل ہو۔" (سورۂ احزاب:۳۳)

قرآن نے یہاں ازواجِ مطہَّرات ہی کو اہلِ بیت کہا ہے جو مضمون سے واضح ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات پر بھی بیوی کو اہلِ بیت کہا گیا ہے مثلاً "سورۂ ھود: آیت ۷۳" میں ہے:

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ط

"فرشتے کہنے لگے کیا تو اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہے اے اہلِ بیت تم پر اللہ کی رحمت ہو اور اس کی برکتیں ہوں۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ (حضرت سارہ) کو یہاں فرشتوں نے ''اہل بیت'' سے یاد کیا جس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ''اہلِ بیت'' میں سب سے پہلے انسان کی بیوی شامل ہوتی ہے چونکہ سورۂ احزاب کی آیت:۳۳ کے آگے پیچھے سارا ذکر ازواجِ مطہّرات رضی اللہ عنھن کا چل رہا ہے، اس لیے وہ تو اہلِ بیت میں نصِ قرآنی کی وجہ سے براہِ راست داخل ہیں، لیکن الفاظ کے عموم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں اور ان کی اولاد بھی داخل ہیں، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت فاطمہ، حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو اپنی چادر میں ڈھانپ لیا اور یہ آیت تلاوت کی اور بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ: ''یا اللہ یہ میرے اہلِ بیت ہیں۔'' (صحیح مسلم)

## صحابہ کرام رضی اللہ عنہم واہل بیت رضی اللہ عنہم کے ساتھ محبت رکھنا لازم ہے

اہلِ بیت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت رکھنا، ان کی عزت واحترام کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے، جس طرح اہلِ بیت کی محبت کے بغیر آدمی مسلمان نہیں رہ سکتا بلکہ نفاق کا شکار ہوتا ہے اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت کے بغیر بھی مسلمان نہیں بلکہ منافق ہے، ان دونوں طبقوں سے دلی محبت وعقیدت رکھنا، دونوں کا ادب واحترام اور تکریم کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتوقیر کی مانند ہے اور ان سے نفرت وبغض رکھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض ونفرت کے مترادف ہے۔

## اہلِ بیت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں عقیدہ

(۱) تمام اہلِ بیت اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جانثار اور دل وجان سے سچے پیروکار تھے،

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سچے، عادل اور معتمد ہیں، کسی مؤمن کو ان کی عدالت پر شک وشبہ کی گنجائش نہیں، وہ ہر کام میں نیک نیت اور پاک باز تھے محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے سب کچھ کرتے تھے۔

ان کا نزاع واختلاف بھی صدق واخلاص پر مبنی تھا، نہ کہ نفس پرستی یا کسی تعصّب پر اس لیے امت کے ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ ان کا تذکرہ صرف بھلائی سے کرے، ان کی برائی اور ان پر طعن وتشنیع وعیب گیری کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

نیز ان کو خطاؤں اور لغزشوں کا مجموعہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کرنا اور ان کی تشہیر کرکے لوگوں کو بد ظن کرنا سب حرام اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے بغض کی علامت ہے۔

(۲) جو لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کرتے ہیں یا ان کی تنقیص کرتے ہیں ان پر خیانت، ظلم اور جھوٹ بولنے وغیرہ کا الزام لگاتے ہیں ایسے لوگ سخت بے دین اور گمراہ ہیں، یہ تمام تر الزامات بے بنیاد، جھوٹ اور بہتان ہیں در حقیقت یہ لوگ ہمارے حق کے گواہوں کو بے اعتبار اور داغ دار کرتے ہیں۔

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخر نبی ورسول ہونا حق ہے اور ان کے تمام اعمال واقوال بھی سراسر حق ہیں اور ہم تک قرآن اور سنت انہی کی وساطت سے پہنچے ہیں۔ لہٰذا جو لوگ ان کے بارے میں عوام الناس کو بد ظن کرتے ہیں تو وہ ہمارے گواہوں کو مجروح کرکے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور قرآن وسنت پر سے اعتماد ختم کرنا چاہتے ہیں اور دینِ اسلام کو درہم برہم کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دنیاوی اغراض سے پاک ہونا، مخلص، متقی اور پرہیز گار ہونا، ایک دوسرے پر مہربان ہونا، ان کا کفر وشرک اور گناہوں سے متنفر ہونا اور سچا وایماندار

ہونا اور امانت دار ہونا قرآن مجید کی واضح آیتوں سے ثابت ہے لہٰذا جو روایت اور تاریخی واقعہ ان کی صداقت و امانت اور ایمان و تقویٰ میں نقصان ڈالتا ہے وہ روایت یا تو بالکل ناقابلِ قبول ہوگی یا اس کو صحیح مقام میں رکھ کر اس کی تاویل لازم ہے کہ یہ مسلَّمہ قاعدہ اور اصولی بات ہے کہ یقین کو شک سے زائل اور ختم نہیں کیا جاسکتا۔

## صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلافات کے بارے میں صحیح نظریہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلافات کے بارے میں مندرجہ ذیل باتوں کو ذہن نشین کریں:

(۱) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تمام تر اختلافات اخلاص پر مبنی تھے نہ کہ ہوائے نفس اور تعصُّب پر۔

(۲) ان اختلافات کے بارے میں منقول اکثر حصہ تو بالکل جھوٹا اور من گھڑت ہے اور تاریخی واقعات جھوٹ اور سچ کا مجموعہ ہیں اور ظاہر ہے کہ جب سچ کے ساتھ جھوٹ شامل ہوتا ہے تو اس میں صحیح رویہ یہی ہے کہ سچ اور جھوٹ دونوں کو سراسر سچ اور حق پر پرکھا جائے پھر جو چیز سراسر سچ کے مطابق ہو تو وہ سچ ہے اور جو اس کے خلاف ہو وہ سراسر جھوٹ اور کھوٹ ہے۔

(۳) ان اختلافات کا جو حصہ تواتُر اور یقین سے ثابت ہے مثلاً ان کے درمیان جنگ کا ہونا۔ اس جنگ میں کون حق پر تھا اور کون خطا پر اس کے بارے میں صحیح نظریہ اور موقف یہ ہے کہ ان کے بارے میں اتنا عقیدہ تو رکھیں کہ دونوں فریق حق کے طلب گار تھے اور ان کا یہ اختلاف اخلاص اور للّٰہیت پر مبنی تھا، لیکن اس سے آگے اپنی زبان اور قلم کو روکیں اور ان کے اس معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں، اس موقف اور نظریہ کی تائید یہ چار وجوہات کرتی ہیں:

(ا) ایک یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اختلاف میں دخل دینا اور ان میں صحیح اور غلط کا حکم لگانا بہت بڑی بے ادبی ہے۔

(ب) دوم یہ کہ جیسا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

تِلْكَ دِمَاءٌ طَهَّرَ اللّٰهُ عَنْهَا اَيْدِيَنَا فَلْنُطَهِّرْ عَنْهَا اَلْسِنَتَنَا

"ان کے خون سے جب اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہاتھوں کو پاک اور محفوظ رکھا تو ہمیں اپنی زبانیں بھی (ان کے نامناسب ذکر سے) پاک رکھنی چاہئیں۔"

(ج) سوم یہ کہ جب یہ بات ثابت ہے کہ تاریخی واقعات اور روایات حق و باطل سچ اور جھوٹ کا مجموعہ ہیں تو ان روایات اور واقعات سے صحیح صورت حال سامنے نہیں آسکتی، ہمارا حال تو یہ ہے کہ اس پروپیگنڈہ کے دور میں ہمارے سامنے جو جنگ چھڑ جاتی ہے تو ہم صحیح صورت حال کو معلوم نہیں کر سکتے اور بہت بار اس بات میں دھوکہ کھا جاتے ہیں کہ غلطی پر ہونے والے کو حق پر سمجھتے ہیں تو جو حالات اور واقعات ہزاروں سال پہلے گذر چکے ہیں اور پھر ان پر یکے بعد دیگرے ایسے لوگوں کی حکومتیں گذر چکی ہیں جو ایک دوسرے کی مخالف ہوں تو اس سے اندازہ لگائیے کہ اس نے تاریخ کو کیا سے کیا بنایا ہو گا۔

لہٰذا ان واقعات میں کون حق پر تھا اور کون غلطی پر؟ اس کا صحیح اندازہ لگانا ممکن ہے، البتہ اتنا یاد رکھیں کہ جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق پر تھا اس کو دوگنا اجر و ثواب ملے گا اور جو خطا پر تھا اس کو اخلاص کے ساتھ خطائے اجتہادی کی بنیاد پر ایک اجر ملے گا۔

(د) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلافات کے بارے میں ہماری رہنمائی قرآن مجید کی یہ آیتِ کریمہ بھی کرتی ہے:

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ
وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

"یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تم کو ملے گا جو کچھ تم نے کمایا اور جو کچھ اعمال وہ کرتے رہے اس کے بارے میں تم سے پوچھ نہ ہو گی۔" (البقرہ:۱۴۱)

جب اللہ تعالیٰ ہم سے ان کے اختلافات کے بارے میں نہیں پوچھتے اور نہ کسی کا حق ہونا قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہے تو پھر اس کے بارے میں زبان اور قلم چلا کر اپنے آپ کو کیوں ایسا بناتے ہیں کہ کل قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے کہ تم نے یہ عقیدہ و نظریہ کس بنیاد پر رکھا تھا اور پھر کیوں لوگوں میں اس کا پرچار کر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لوگوں کو بد ظن کرتے پھریں۔

## سنی جماعت کا تعارف

(۱) سنی کا لفظ اہل سنت والجماعۃ کو مختصر کر کے بنایا گیا ہے اور یہ اہل سنت والجماعت کی مختصر تعبیر ہے جیسا کہ پی، آئی، اے پاکستان انٹرنیشنل ائیر لائنز سے نکلا ہے اور وہ اس کی مختصر تعبیر ہے۔

(۲) جب ہم کہتے ہیں کہ ہم سنی ہیں تو مسلمان کے مقابلے میں نہیں کہتے، بلکہ اسلام کے نام پر جو گمراہ فرقے وجود میں آچکے ہیں ان باطل فرقوں کے مقابلہ میں ہم کہتے ہیں کہ ہم سنی مسلمان ہیں جیسا کہ جب دنیا میں انسانوں کی اقوام اور ممالک بڑھ گئے تو ہم کہتے ہیں کہ ہم پاکستانی یا سعودی وغیرہ اور فلاں قوم اور علاقے کے رہنے والے ہیں، اس تعریف وتعارف سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم انسان نہیں، پاکستانی یا سعودی ہیں، بلکہ یہ انسانوں کے مختلف ممالک اور مختلف قوموں وغیرہ کے مقابلے میں کہا کرتے ہیں تاکہ پوری طرح ہماری شناخت اور تعارف ہو سکے۔

اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ ہم سنی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پرویزی، خارجی، رافضی، معتزلی وغیرہ نہیں، بلکہ سنی مسلمان ہیں۔

(۳) "اہل سنت والجماعت" یہ سچے مسلمان اور دینِ اسلام کی ایسی مختصر تعبیر ہے جس کی وجہ سے باطل فرقوں کو چھانٹ دیا جاتا ہے اور یہ دینِ اسلام کا وہ شناختی کارڈ ہے جس سے سچے مسلمان اور نام نہاد جعلی مسلمان میں امتیاز کیا جاتا ہے۔

(۴) اہل سنت والجماعت وہ جماعت ہے جو قرآن اور سنت رسول اللہ ﷺ کو حُجّت اور واجب الاتباع مانتی ہے اور قرآن مجید اور سنت کی حامل جماعت، جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی حُجّت اور معیارِ حق مانتی ہے اور ان کے اجماعی اور اتفاقی فیصلوں کو بھی واجب الاتباع مانتی ہے۔

(۵) سچی اتباع کے لیے محبت اور عقیدت لازم ہے اس لیے یہ جماعت تمام اہلِ بیت اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ محبت اور ان کے ساتھ پوری عقیدت رکھتی ہے اور ان سب کا احترام کرتی ہے اور وہ سب کے احترام وادب کو لازم قرار دیتی ہے۔

(۶) جس مسئلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہو اس میں وہ کسی ایک جانب کو ترجیح دے کر اس کو اپناتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی طرح جانب مخالف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اعتراض نہیں کرتے اور نہ ان کی تحقیر کرتے ہیں، بلکہ وہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم ﷺ کی نبوت کی آنکھوں کی پلکیں اور ابرو سمجھ کر ان پر تنقید سے پرہیز کرتے ہیں۔

عقائد کی پوری تفصیل کے لیے کتاب العقائد کو پڑھ لیجیے۔

بندہ مختار الدین کربوغہ شریف

۲۱ جمادی الاول ۱۴۲۰ھ

۲ ستمبر ۱۹۹۹

# یادداشت:

# یاداشت:

# یاداشت:

حضرت مولانا مفتی سید مختار الدین شاہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ

# کی چند دیگر تصنیفات





دار الایمان
DARUL-EEMAAN
www.daruleeman.org